الا بذکر اللہ تطمئن القلوب
اللہ کے ذکر سے ہی دل اطمینان پاتے ہیں (قرآن کریم)

راحت القلوب

تقریر لطیف:
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
قدس سرہ

یہ بے حد نافع اور نہایت دلچسپ وعظ ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ کے ذکر اور احکام شریعت پر عمل کرنے سے ہی دلوں کو اطمینان اور چین ملتا ہے

پیشکش:-
مجلس صیانۃ المسلمین فیصل آباد۔

دفتر ۶۱۵/اے پیپلز کالونی ۲ فیصل آباد۔ فون: ۴۳۶۱۵

مجلسِ صیانۃ المسلمین

میں شرکت کیلئے آپ حضرات فوری طور حسبِ ذیل پروگرام شروع فرمادیں

۱۔ نماز باجماعت کا التزام کریں اور اپنے حلقہ اثر میں نہایت دل سوزی وحکمت سے اسکی دعوت جاری رکھیں۔

۲۔ مجلس کے ماتحت جہاں جہاں بیانات اور درسوں کا انتظام ہو اس میں شرکت کریں۔ اور شرکت کی بھرپور دعوت دیا کریں۔

۳۔ کسی متبع سنت عالم کے مشورہ سے روزانہ کچھ دیر ذکر اللہ کا اہتمام ضرور رکھیں۔

۴۔ بہشتی زیور، اصلاحی نصاب، تسہیل المواعظ، اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی آسان کتب کا روزانہ مختصر درس اپنے گھروں میں جاری کریں۔ اور اپنے حلقہ احباب میں گھر گھر جاری کرانے کی سعی کریں۔

وما توفیقنا الا باللہ،

یہ وعظ جامعہ اسلامیہ امدادیہ گلشن امداد بستیانہ روڈ فیصل آباد سے بھی طلب کیا جاسکتا ہے۔

سلسلہ خطباتِ حکیم الامتؒ

مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ (القرآن)

راحت القلوب

از افاضات

مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

ناشر

مجلس صیانۃ المسلمین A/5/6 پیپلز کالونی ۲ فیصل آباد

(فون نمبر: ۴۲۲۱۵)

کتبہ فاتی خوشنویس میانوال

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تعارفِ وعظ و ضروری فوائد	۴	۱۴	مقصودِ اصلی سب کا راحتِ قلب ہے	۲۴
۲	خطبہ و آیت شریفہ	۶	۱۵	دعویٰ بالا کی امثلہ سے توضیح	۲۶
۳	مسلمانوں میں افسوس ناک تبدیلی	۶	۱۶	حضرت سلیم چشتیؒ کے زہد و فہم کی حکایت	۲۸
۴	آخرت کے متعلق غلط روش	۷	۱۷	حضرت غوثِ پاک کی دُنیا سے بے رغبتی	۲۹
۵	فکرِ آخرت پیدا کرنے کے لیے مجبوری	۸	۱۸	چین صرف ذکر اللہ سے ملتا ہے۔	۳۱
ہ	اعمال کے منافع بیان کرنے کی ضرورت		۱۹	راحت اور چیز ہے سامان راحت	۳۱
۶	قرآن پاک کا حکیمانہ انداز	۱۱	،،	اور چیز۔	
۷	تفسیر آیات	۱۳	۲۰	صحیح الحس آدمی زائد از ضروریات	۳۶
۸	ذکر کی ضرورت و برکت	۱۴	،،	سامان سے گھبراتا ہے۔	
۹	کلابی تقوے	۱۶	۲۱	ایک مطلب خیز حکایت	۴۰
۱۰	دنیا و آخرت میں فرقِ مراتب ضروری ہے۔	۱۷	۲۲	ہمارے لیے تو سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔	۴۱
۱۱	شانِ مسلم	۲۰	۲۳	ذکر اللہ کی برکت اور اسکی حقیقت	۴۷
۱۲	درحقیقت سب لوگ ایک ہی چیز کے طالب ہیں۔	۲۱	۲۴	ظاہری تکلیف اور قلبی راحت جمع ہونے کی وضاحت مثالوں سے	۴۸
۱۳	مقصد بالا کی توضیح کے لیے عجیب مثال	۲۳	۲۵	حضرت عطارؒ کے توجہ الی اللہ کا باعث	۵۶

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲۶	حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے وقت نکال کر خود امتحان کرلو۔	۵۷
۲۷	محبوب حقیقی کو راضی کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرو۔	۶۰
۲۸	بندگی تو رائے ختم کرنے کا نام ہے خدائی کے طالب نہ بنو۔	۶۲
۲۹	ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ۔	۶۴
۳۰	جس درجہ کا ذکر ہوگا اسی درجہ کا اطمینانِ قلب۔	۶۵
۳۱	اصلاح کے لیے کسی شیخ کامل کی محبت و اتباع ضروری ہے۔	۶۸
۳۲	دخول جنت کا ذریعہ اللہ کے بندوں سے لگے لپٹے رہنا ہے۔	۶۸
۳۳	مفید مطلب اور دلچسپ حکایت	۷۰
۳۴	پیر اور مرید کے تعلق کی مثال	۷۲
۳۵	پیر کے لیے صاحبِ کشف ہونا ضروری نہیں، نہ ہی کشف کمال ہے۔	۷۲
۳۶	پیر کے سامنے اپنے امراض صاف صاف بیان کرنے ضروری ہیں۔	۷۳
۳۷	طریق اصلاح کا نچوڑ	۷۵
۳۸	محقق شیخ مرید کے عیوب پر مطلع ہو کر کبھی اس کو حقیر نہیں سمجھتا۔	۷۶
۳۹	ایک لطیفہ	۷۹
۴۰	خلاصہ بیان	۸۰

تعارف وعظ راحت القلوب

بتاریخ ۲۳ صفر ۱۳۳۴ھ قصبہ جلال آباد (یوپی انڈیا) میں حضرت حکیم الامت رح نے نہایت جامع و موثر تقریر فرمائی اس میں حضرت موصوف نے ثابت فرمایا کہ ذکر اللہ ہی ایسی چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان اور چین ملتا ہے۔ راحت قلوب حاصل کرنے اور مقصود زندگی تک رسائی حاصل کرنے کا طریق اس میں نہایت عمدہ پیرایہ سے بیان فرمایا گیا ہے۔ یہ وعظ علاوہ بے حد نافع ہونے کے غایت درجہ کا دلچسپ بھی ہے۔

اس وعظ کو عارف ربانی حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے ضبط فرمایا تھا، پھر ۱۳۳۶ھ ماہ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں بحالت اعتکاف اس کو صاف کر کے عید کے موقع پر نظر اصلاحی کے لیے حضرت حکیم الامت کی خدمت میں پیش کیا جو ہدیہ عید ثابت ہوا۔ اسی لیے اس کا لقب "ہدیہ مرغوب" تجویز فرمایا گیا۔

فائدہ ۱: اس وعظ کو ضبط کرنے والے جیسا کہ اوپر گزرا حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس قسمت اللہ آباد ہیں۔ آپ ۱۶ شعبان ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۲ جون ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام "مرغوب احمد" تھا۔ پہلے ڈپٹی کلکٹر تھے پھر بوجہ تقوے اس عہدہ کو چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی، آپ حضرت حکیم الامت کے خلیفہ مجاز تھے، حضرت سے والہانہ محبت کا تعلق تھا۔ بوجہ قرب و خصوصیت خسرو اشرفی کہلاتے تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد ہمیشہ بے قرار رہتے تھے۔ آخر ۱۷ اگست ۱۹۴۴ء کو صبح ۸ بجے دار فانی سے رخصت فرما کر

اپنے محبوب سے جاملے۔

خواجہ صاحب بلند پایہ شاعر بھی تھے، تخلص "مجذوب" تھا۔ آپ کے پُرحکمت اشعار کا ایک حصہ "کشکول مجذوب" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

فائدہ ۲: حضرت حکیم الامت کے مواعظ مبارکہ کو نہایت ہی احتیاط سے ضبط کیا گیا ہے۔ دورانِ وعظ کوئی بزرگ ساتھ ساتھ لکھتے جاتے، بعد میں اس کو صاف کرکے حضرت حکیم الامت کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ حضرت کی اصلاح و اجازت سے طبع کیا جاتا۔

فائدہ ۳: مجلس نے مضامین وعظ کی پیراسازی کرکے اس پر مناسب عنوانات کا اضافہ کیا ہے۔ اضافہ عنوانات تسلسل بیان کے لیے قاطع ہونے اور دیگر ذوقی وجوہ سے مجلس کے ذوق کے خلاف ہے۔ ذوقِ جدید والوں کی حدِ جواز کے اندر رعایت کرتے ہوئے ایسا کیا گیا ہے۔ اشعار کا ترجمہ ہر شعر کے بعد، اور بعض مشکل الفاظ کا ترجمہ ساتھ ہی بریکٹ میں دیا گیا ہے۔ بریکٹ کے اندرونی الفاظ کو ادارہ کی طرف سے اضافہ سمجھیں۔

نذیر احمد عفی عنہٗ
جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

کتابت و سرورق: فانی خوشنویس خانیوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

یہ ایک جملہ ہے جو ایک آیت کا جزو ہے۔ اس میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک بہت بڑی ضرورت کی چیز بتلائی ہے اور وہ چیز ایسی ضرورت کی ہے کہ فقط دین ہی کی ضرورت کی نہیں بلکہ دنیوی ضرورت کی بھی ہے۔

مسلمانوں میں افسوس ناک تبدیلی

مجھ کو اس حیثیت سے کہ میں یہاں احکام الٰہی پہنچانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ دنیوی ضرورت کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر کیا کیا جاوے۔ ہمارے بھائیوں کا کچھ مذاق ہی ایسا ہو گیا ہے کہ جب تک ان کو دین کے ساتھ دنیا کی بھی چاٹ نہ دی جائے وہ دین کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے

چنانچہ خالص دین کی طلب کو اکثر نظرِ تحقیر و انکار سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر کوئی بیچارہ مولوی محض آخرت کی طرف بلاتا ہے تو اس کو بیوقوف بنایا جاتا ہے اور اعتراض کرتے ہیں کہ بس مولویوں کو تو آخرت ہی آخرت یاد رہ گئی ہے۔ دوسری قومیں دنیا میں کیا کیا ترقی کر رہی ہیں اور مسلمان ہیں کہ روز بروز گرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ لیکن ان مولویوں کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ بس انہوں نے تو فقط ایک آخرت ہی یاد کر لی ہے۔ اور یہ تو جناب خوش عقیدوں کا حال ہے۔ ورنہ بہت سی جماعتیں مسلمانوں میں اب ایسے لوگوں کی بھی پیدا ہو چلی ہیں جو صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ ہمیں آخرت ہی میں شک ہے اور پھر بھی اپنے کو مسلمان کہتے ہیں معلوم نہیں کہ اسلام کیا چیز ہے کہ کفر بھی اس کی ایک فرد ہے۔

آخرت کے متعلق غلط روش

خیر ایسوں کا تو ذکر ہی نہیں کیونکہ عام لوگ بھی انہیں مسلمان نہیں سمجھتے لیکن ان کی بھی جو آخرت کے قائل ہیں یہ حالت ہے کہ آخرت اور امورِ آخرت کو گو اعتقاد کے درجہ میں خفیف نہیں سمجھتے لیکن معاملہ کے درجہ میں ضرور خفیف سمجھتے ہیں، یعنی جو وقعت اور اہتمام دنیا کا انہیں ہے آخرت کا نہیں۔ اس قدر تو کیا معنی اس کا دسواں حصہ بھی نہیں پھر غضب یہ ہے کہ اس عدم اہتمام کا کچھ غم بھی نہیں اگر اس حالت پر تاسف ہی ہوتا۔ اپنی کوتاہی کا احساس ہی ہوتا اس کی تمنا ہوتی کہ کاش کوئی ایسی صورت ہو کہ طلب آخرت پیدا ہو جائے تو خیر غنیمت تھا۔ کبھی اہتمام کی بھی نوبت آجاتی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آخرت سے بےفکری اور اس کے فکر سے بھی بےفکری۔ اس پر بھی افسوس نہیں کہ ہم کو اس کی فکر

نہیں۔ چنانچہ آخرت کی تعلیم پر بھی اعتراض کرتے ہیں اور اس کی ذرا وقعت[1] نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ مولویوں نے تو بس آخرت ہی آخرت یاد کر لی ہے، بچوں کو آخرت کی تعلیم دینے کے وہ یہ معنی سمجھتے ہیں کہ وہ بچہ دنیا سے بالکل ہی بے[2] کار ہو جاویگا۔ یہ ایک بڑی کمی ہو گئی ہے ہم میں کہ آخرت کے متعلق یہ خیال جم گیا ہے کہ اس میں لگ کر آدمی دنیا سے بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ بخلاف دنیا کے کہ اس کی طلب میں دن رات منہمک[3] ہیں اور اس مشغولی میں دین سے جو کچھ غفلت ہے ظاہر ہے، لیکن وہاں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس میں پھنس کر آدمی دین سے بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔

فکرِ آخرت پیدا کرنے کے لئے بجبوری اعمال کے منافع دنیوی بیان کرنے کی ضرورت

غرض دنیا کو ہم لوگوں نے ایسا قبلہ[4] توجہ بنا رکھا کہ مصلح[5] کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ جب آخرت کی ترغیب دی جائے تو اس میں دنیا کا بھی نفع بتلایا جاوے۔ اور جب اعمال کے فضائل[6] بیان کیے جائیں تو ان میں دنیوی منافع بھی دکھلائے جاویں کہ شاید اسی لالچ میں آخرت کی طرف توجہ ہو جائے۔ جیسے بچے کو انہیں جب پہلے پہلے گلستان بوستان پڑھاتے ہیں تو ان کو چاٹ مٹھائی کی دی جاتی ہے۔ شروع میں تو وہ سبق پڑھتے ہیں مٹھائی کے لالچ میں۔ لیکن جب پڑھتے پڑھتے ایک ذوق[7] علم کا پیدا ہو جاوے گا

---

[1] عزت قدر [2] جو کسی کام کا نہ ہو [3] کسی کام میں بہت بڑی کوشش کرنے والا۔
[4] توجہ کا مرکز [5] اصلاح کرنے والا [6] بزرگیاں [7] فائدے [8] لذت و مزہ

تب وہی کہیں گے کہ لو ہمارے کپڑے اُتار لو، تم ہمیں سے مٹھائی لے لو۔ لیکن سبق پڑھا دو۔ دیکھئے ایک دن وُہ تھا کہ مٹھائی کے لالچ سے پڑھتا تھا۔ آج وُہ نوبت ہے کہ جب کتاب کا سبق ہوتا ہے تو نہایت شوق سے پہنچتا ہے اور اُستاد سے منتیں کرتا ہے۔ کہ للہ میری طرف توجہ کیجئے کہیں راضی کرنے کے لئے مٹھائی پیش کرتا ہے، کہیں طرح طرح کی خدمتیں کرتا ہے۔ کبھی اُستاد اس پر ناخوش بھی ہوتا ہے تب بھی وُہ ذرا ناگوار نہیں گزرتا بلکہ جس قدر اپنے معلّم کو دیکھے کہ مارتا ہے جھنجلاتا ہے یہ اور الٹا خوش ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اوپر اُستاد کی بڑی توجہ ہے وہ اس کو علامت توجہ کی قرار دے کر اور الٹی مٹھائی پیش کرتا ہے۔ دیکھئے یہ وہی بچہ ہے کہ جو مٹھائی لے لے کر بمشکل پڑھتا تھا آج وہ دن ہے کہ خود مٹھائی دے کر پڑھ رہا ہے۔ بات کیا ہے کہ اب اس کو علم کا چسکا لگ گیا ہے۔

اپنے بچپن کی حکایت یاد آئی میرٹھ کا ذکر ہے۔ والد صاحب نے میرے اُستاد کو جن سے میں قرآن شریف یاد کرتا تھا علیحدہ کرنا چاہا تھا۔ ہمیں حفظ کا شوق ہو گیا تھا۔ نہایت شاق گذرا بس شور و واویلا کرنا شروع کر دیا ہر چند والد صاحب نے سمجھایا کہ دوسرے حافظ جی بلا دیں گے۔ ڈانٹا بھی لیکن ایک نہ سنی کہ نہیں میں تو انہیں سے پڑھوں گا۔ آخر عاجز ہو کر چلے گئے، کہنے لگے کہ خدا جانے لونڈے کو کیا کھلا دیا ہے کہ مستخر ہی ہو گیا۔ غرض مغلوب ہو کر ہار کر چلے گئے۔ حالانکہ وُہ حافظ جی ایسے تیز مزاج تھے کہ اس زمانہ میں بھی جب کہ مولویت کا نام ہو گیا تھا اور سچ مچ کی مولویت تو اب بھی نصیب نہیں ہوئی۔ میں

ایک دفعہ میرٹھ گیا تھا اور ان کو دور میں قرآن شریف سُنا رہا تھا، متشابہ جو لگا تو بس حافظ جی کو جوش آگیا اور اُٹھ کر منہ پر ایک زور سے دھپ رسید کیا لیکن الحمد للہ تعالےٰ مجھے ذرا ناگوار نہیں گزرا۔ بس نیچی نگاہ کیے چپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد حافظ جی کو جو خیال آیا تو بس ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے بیٹھ گئے کہ للہ معاف کر دو، میں نے سخت بے ادبی کی، تم مولوی ہو، میں نے کہا حضرت یہ آپ کیا فرما رہے ہیں یہ جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہے سب آپ ہی کا طفیل ہے۔ آپ کو تو ساری عمر مارنے پیٹنے کا حق حاصل ہوگا اور واقعی مجھے مطلق ناگوار نہیں گذرا۔ لیکن حافظ جی بیچارے ایسے شرمندہ تھے کہ نگاہ نہیں اٹھتی تھی۔ میں نے بہت کچھ عرض معروض کیا مگر نہیں مانے معاف ہی کرا کر چھوڑا۔ تو جناب میں نے اس پٹنے پر ایسا فخر کیا کہ آج اپنی اس ذلت کو سب کے سامنے کس خوشی کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ تو بات کیا تھی محض یہی کہ جس چیز کے سبب یہ سب کچھ ہوا اس کا بس شوق پیدا ہو گیا تھا اگر اس سے بھی زیادہ سختی کرتے تب بھی گوارا ہوتا ہندی مثل بھی تو ہے۔ کہ دودھ دیتی گائے کی لات بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عطارؒ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گرم گوید سرد گوید خوش بگیر

(ترجمہ:۔ خواہ وہ سخت بات کہے خواہ نرم بات کہے تو دونوں صورتوں میں خوش ہو) غرض جس شخص کو کسی ایسی چیز کی طلب ہو جس کو وہ ضروری سمجھتا ہو اس کو اس کے حاصل کرنے کے لیے سب ہی کچھ گوارہ ہوگا۔ اسی طرح بچوں کے ساتھ یہ گھر گھار تو جبھی تک ہے جب تک انہیں سمجھ نہیں۔ جب بڑے ہوئے اور

اپنا نفع نقصان سمجھنے لگے تو پھر وہ خود ہی پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اس کے قبل تو البتہ کچھ لالچ ہی دینے سے رستہ پر آسکتے ہیں جب فہم درست ہوگئی تو پھر ہمیں ضرورت ہی کیا ہے لالچ دینے کی۔ پھر تو بس ضابطہ کا برتاؤ ہوتا ہے پھر ہم کیوں خوشامد کریں اور کیوں ان کے پیچھے پیچھے پھریں انہی کی غرض ہے۔ وہی الٹی ہماری خوشامد کریں۔

قرآن پاک کا حکیمانہ انداز

چنانچہ حق تعالےٰ نے بھی قرآن مجید میں تعلیم کے اندر تدریج کا بہت اہتمام فرمایا ہے اوّل میں مضامین اور طرح کے ہیں یعنی احکام بہت ہی کم بس تھوڑے تھوڑے اور کہیں کہیں ہیں۔ شروع میں زیادہ عقیدوں کی درستی کی گئی ہے پھر آہستہ آہستہ جس قدر سہار ہوتی گئی احکام نازل ہوتے گئے۔ جیسے اوّل بچہ کو دودھ دیتے ہیں۔ پھر کچھ دن بعد جب معدہ میں قوت آچلی تو کچھ حلوا دینے لگے پھر کچھ روز روٹی چور کر کھلائی اتنے میں دانت نکل آئے اور کچھ چلنے لگے تو اب ایک آدھ ریشہ بوٹی کا بھی دینا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ خوب گوشت روٹی پلاؤ زردہ سب ہی کچھ کھانے لگا پھر تو ماشاء اللہ تعالےٰ یہ حالت ہوگئی کہ جو کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی کھالیا بس بیٹھے بیٹھے سب ہضم۔ اگر اوّل ہی بچہ کو حلوا اور گوشت روٹی کھلا دی جاوے تو بجز اس کے کہ اس غریب کے امعاء (آنتیں) پھٹ جائیں اور کیا نتیجہ ہوگا۔ اسی طرح حق تعالےٰ نے تعلیم میں نہایت تدریج اختیار فرمائی ہے۔ جیسا مذاق مکلّف کا دیکھا ویسی ہی اس کو ترغیب دی۔ چنانچہ حق تعالےٰ نے جا بجا جہاں ثمرات آخرت کا ذکر فرمایا ہے، وہاں

طاعات پر جو دنیوی ثمرات مرتب ہوتے ہیں ان کو بھی بیان فرمایا ہے دیکھئے ارشاد ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔ (ترجمہ اگر وہ لوگ قائم رکھتے توراۃ اور انجیل کو اور اس کتاب کو جو نازل کی گئی ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے یعنی قرآن تو البتہ کھاتے وہ لوگ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے) القرآن یعنی اگر یہ لوگ احکام کا پورا اتباع (پیروی) کرتے تو ان کے اوپر سے بھی کھانے کو ملتا اور نیچے سے بھی کھانے کو ملتا یعنی اوپر سے بارش اور نیچے سے پیداوار، تو دیکھئے اللہ تعالےٰ کی اطاعت کھانے پینے کے لیے نہیں ہے۔ کھانا تو کافروں کو بھی ملتا ہے۔ بلکہ بہائم (چوپائے) کو بھی اور وہ بھی کس قدر بلا مشقت مگر پھر بھی کیوں ذکر فرمایا۔ اسی واسطے کہ خیر کوئی کھانے پینے کا لالچی اسیطرح اس طرف آجاوے تو دیکھئے ارشادِ خداوندی سے معلوم ہوا کہ اعمالِ آخرت کے اندر دنیوی منافع بھی ہیں اسی طرح معاصی کے اندر دنیا کی مضرت بھی ہوتی ہے جیساکہ حدیث میں وارد ہے اِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِخَطِيْئَةٍ يَعْمَلُهَا (بے تحقیق بندہ اس گناہ کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے جس کو وہ کرتا ہے) دیکھئے بسبب گناہ کے رزق کا گھاٹا بھی ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے مضامین سے تمام حدیثیں بھری پڑی ہیں۔ اس کی تفصیل بقدر ضرورت میرے رسالہ[1] جزاء الاعمال میں ملے گی۔ اس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ طاعات میں دنیا کے کیا کیا نفع ہیں۔ اور معاصی میں دنیا کی کیا کیا مضرتیں ہیں۔ اس کے لکھنے سے میری

---

[1] یہ رسالہ قابلِ مطالعہ ہے۔ جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

یہی غرض تھی کہ خیر لوگ دُنیا ہی کے نفع نقصان کو سوچ کر دین کی طرف متوجہ ہو جائیں اسی طور پر حق تعالیٰ نے یہاں بھی ایک ایسی چیز بتلائی ہے جو دنیا کے نفع کی بھی اور دین کے نفع کی بھی اور ظاہر بات ہے کہ جو دین اور دنیا دونوں کے نفع کی چیز ہو وُہ بڑی ہی ضرورت اور کام کی چیز ہوگی۔

تفسیر آیت چنانچہ فرماتے ہیں اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یاد رکھو سمجھ رکھو (یہ مدلول ہے کلمہ الا کا) حصر[1] کے ساتھ فرماتے ہیں (یہ مدلول[2] ہے تقدیم معمول کا) کہ خُدا ہی کی یاد کے ساتھ دلوں کو چین ملتا ہے فقط ایک چیز ہے جس سے دلوں کو چین ملتا ہے۔ تمام عالم میں چراغ لے کر ڈھونڈ آؤ کوئی دوسری چیز ایسی نہ ملے گی جس سے دلوں کو چین حاصل ہو سکے کیوں کہ ظاہراً حصر سے مراد حصر حقیقی ہی ہے (اس کے بعد حصر حقیقی اور حصر اضافی کی نفیس بحث تھی جو قلمبند نہ ہو سکی) کیوں کہ اصل میں حصر حقیقی ہی ہوتا ہے بلا ضرورت اور بلا دلیل اضافی مراد نہیں لیا جاتا اور یہاں حصر کے اضافی ہونے کی کوئی دلیل نہیں نیز اور کسی چیز کا موجب اطمینان ہونا ثابت بھی نہیں، جیسا کہ عنقریب واضح ہو جاوے گا۔ جب مشاہدہ ہے حصر کے حقیقی ہونے کا پھر اضافی کیوں کر مراد ہو سکتا ہے۔ غرض یہاں کوئی دلیل نہیں کہ عدول[3] کیا جاوے، حصر کے حقیقی ہونے سے جب کوئی دلیل نہیں اور مشاہدہ بھی اس کا مؤید[4] تو اس کو حقیقی ہی کہا جاویگا لہٰذا خدا کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ سوائے اس کی یاد کے چین کی کوئی چیز ہی

---

[1] گھیرنا [2] معنیٰ [3] پھر جانا راہ سے، روگردانی کرنا۔ [4] تائید کرنے والا۔ مدد کرنے والا۔

نہیں۔ قرار اور سکون اگر ملتا ہے تو بس خدا کی ہی یاد سے۔ تو دیکھئے اس کے بیان فرمانے میں کسقدر اہتمام فرمایا ہے چنانچہ اَلَا سے کلام شروع کیا یعنی دیکھو ہوشیار ہو کر سُن لو اور سمجھ لو یاد کر رکھو خدا کی ہی یاد ایک ایسی چیز ہے جس سے قلوب کو چین ملتا ہے۔ دُنیا بھر میں کوئی اور چیز ایسی نہیں جو قلب کو راحت پہنچا سکے، واقعی حضرت بہت بڑا دعوےٰ ہے کہ یہی وُہ چیز ہے جس میں قلوب کا چین منحصر[1] ہے آپ صاحبوں کو اس ترجمہ سے آج کے بیان کا مقصود معلوم ہو گیا ہو گا، حق تعالےٰ حصر کے ساتھ فرماتے ہیں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ کہ سوائے یاد خدا کے کسی چیز میں قلوب کا چین نہیں اور ہر چند کہ ترجمہ سے تو مقصود ترغیب ہی ہے ذکر کی لیکن قرینہ[2] مقام سے خود ترغیب سے مقصود اس کا امر کرنا اور اس کا ضروری ہونا بتلانا ہے اس بنا پر اس کے متعلق میرے ذمہ دو باتیں ثابت کرنا ہیں ایک تو یہ کہ ذکر اللہ تعالےٰ ضروری چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں جس میں قلوب کو چین حاصل ہو سکے اوّل جُز ضروری ہوتا ہے۔

ذکر کی ضرورت و برکت

سو ضرورت اس کی بالکل ظاہر ہے کیونکہ یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس میں دنیا کا بھی نفع ہے دین کا بھی۔ پھر اس سے زیادہ ضرورت کی کیا چیز ہو گی؟ ذرا توجہ کرے تو ہر شخص اس کی ضرورت کو سمجھ سکتا ہے کیوں کہ جو چیز دنیا اور آخرت دونوں کے کام کی ہو ظاہر ہے کہ وہ بہت ہی ضرورت کی چیز ہو گی۔ خیر آخرت کو ابھی رہنے دیجئے دنیا ہی کے نفع کو دیکھئے اس سے شاید آخرت کی رغبت ہو جاوے

---

[1] جس پر انحصار ہو۔ دارومدار ہو [2] مقام سے مناسبت

حالاں کہ آخرت اور دنیا میں مسلمان کو ایسا علاقہ[1] رکھنا چاہیے تھا کہ اگر کسی چیز میں دنیا کا نفع بتلایا جاتا تو جب تک اس میں آخرت کا بھی نفع نہ معلوم ہو جاتا مسلمان کو اس کی طرف رخ بھی نہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر دنیا کے نفع کی چیز کی طالب[2] حق کو رغبت دلائی جاتی تو وہ یہ سوال کرتا کہ اس میں کچھ دین کا بھی فائدہ ہے؟ اور اگر دین کا فائدہ کچھ نہ بتلایا جاتا تو وہ یہ کہتا کہ اجی جب دین ہی کا نفع نہیں تو پھر یہ کچھ بھی نہیں اور اس طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ اسی طرح اگر کسی کام میں یہ کہا جاتا کہ اس میں دین کا فائدہ تو ہے لیکن دنیا کا نفع کچھ بھی نہیں تو طالب حق کی یہ شان تھی۔ کہ فوراً اس کی زبان سے نکلتا کہ خیر بھائی اصل چیز دین ہے دین کا فائدہ چاہیے، دُنیا کا نفع نہیں ہے نہ سہی اور بے[3] تامل اس کام کو کر لیتا۔ اب معاملہ بالکل برعکس[4] ہو رہا ہے۔ یہاں تک نوبت[5] پہنچ گئی ہے کہ آج اگر ہم آخرت کی تعلیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور اعمالِ آخرت[6] کی ترغیب دیتے ہیں تو ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیوں صاحب اسمیں کچھ دنیا کا بھی نفع ہوگا؟ اب اس کے جواب کی فکر ہوتی ہے۔ واللہ مجھے تو بہت ہی شرم آتی ہے کہ اعمال آخرت میں دنیوی منافع بیان کروں۔ لیکن کیا کروں آج کل کچھ مذاق ہی بگڑ گیا ہے۔

ہمارے ایک عزیز تھے سب انسپکٹر نہ نماز نہ روزہ۔ ان کی بیوی بیچاری بڑی نیک بخت اور نمازی تھی۔ اس نے جو اپنے میاں سے نماز پڑھنے کے لیے کہا تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ تو اتنے دن سے نماز پڑھتی ہے تجھی کو کیا وصول ہوا جو مجھی کو وصول ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم تو

---

[1] تعلق [2] حق کو چاہنے والا [3] بغیر سوچے سمجھے فوراً [4] الٹ [5] وقت کسی چیز کا۔ مرتبہ۔ باری [6] آخرت کے اعمال یعنی وہ کام جو آخرت کے لیے مفید ہوں جیسے ذکر نماز، روزہ وغیرہم

(مع مال واولاد حقیقتاً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا) سے اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں (القرآن پارہ ۲) لیجئے وہ وصول ہونا اسے سمجھتے تھے جیسا کہ ایک صاحب کو وصول ہوتا تھا۔ کوئی عہدہ دار تھے بڑے وظیفخی۔ ایک بزرگ سے بیعت بھی تھے۔ ان کے ہاں بالائی[1] آمدنی کا خوب بازار گرم رہتا تھا جس کا مبارک نام رشوت ہے۔ بالائی آمدنی اور دست غیب اس کے آداب والقاب ہیں۔ "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ" دستِ غیب تو کیا ہوتا دست عیب کہئے۔ غرض طلوع صبح صادق سے طلوعِ آفتاب تک گویا مَابَیْنَ الطَّلْوَعَیْنِ اس کا وقت مقرر تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کر مصلیٰ پر بیٹھ کر ادھر انہوں نے وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ ادھر روپیوں کا مینہ برسنا شروع ہوگیا، موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ہے کھٹ کھٹ کر رہے ہیں۔ اور خادم ہے کہ لوگوں کو لا لا کر پیش کر رہا ہے لیکن اشاروں سے سب معاملات طے ہوتے ہیں کیوں کہ اگر بول پڑیں تو وظیفہ نہ خراب ہو جاوے۔ جی ہاں رشوت سے تو وظیفہ نہ بگڑا اور بولنے سے بگڑتا ہے۔ انگلیوں کے اشاروں سے بتلاتے تھے کہ دو سو یا تین سو کس قدر۔ مگر بولتے نہیں تھے۔ کیوں کہ اگر بول پڑیں گے تو وظیفہ بگڑ جائے گا۔

کلابی تقویٰ واقعی بعضوں کا تقویٰ کلابی تقوے ہوتا ہے یعنی کتے کا سا تقوے کہ منہ کو تو نجاست سے بچاتا نہیں، مگر پیشاب جب کرے گا تو ٹانگ اُٹھا کر کہ چھینٹے نہ پڑ جاویں بیچارہ بہت ہی محتاط اور متقی ہے۔ یعنی ٹانگ کی اتنی حفاظت کہ پیشاب کے چھینٹے بھی نہ پڑنے پاویں اور منہ سے

[1] اوپر کی آمدنی سے دو طلوعوں کے درمیان کا وقت یعنی صبح صادق سے سورج نکلنے کے وقت تک

گوہ کھاتا ہے۔ تو بعضوں کے تقویٰ کی یہی حالت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان صاحب کا بھی ایسا ہی تقویٰ تھا کہ رشوت سے تو وظیفہ نہ بگڑتا تھا لیکن بولنے سے بگڑتا تھا۔ اس لیے اشاروں سے معاملہ طے کیے جاتے تھے۔ اہل مقدمہ[1] آیا سلام کیا، کہا حاضر لایا ہوں۔ زبان سے بول نہیں سکتے کیوں کہ حضرت وظیفہ میں ہیں، مصلّے اُٹھا دیا کہ نیچے رکھ دو، پچاس ساٹھ جیسی قسمت ہوئی، تو جناب یہ تھی نماز بار[2] آور کہ روز مصلّے کے نیچے سے روپے برامد[3] ہو جاتے تھے وُہ سب انسپکٹر بھی بس ایسی ہی نماز چاہتے تھے۔ آپ بیوی سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری بھی ایسی ہی نماز ہے یا خالی خولی ٹکریں ہی ہیں ایسی نماز سے سوائے اس کے کہ گھر بار کے کاروبار[4] کا حرج ہوا اور کیا حاصل ہوا؟

یہی ہمارے بھائیوں کا حال ہے کہ جب انہیں دین کی رغبت دی جاتی ہے۔ تو پوچھتے ہیں کہ اس سے کچھ دنیا کا نفع بھی حاصل ہوگا؟ لیکن خوب سمجھ لیجیے۔ میں دنیا کی تحصیل[5] سے منع نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ مقصود اصلی کیا چیز ہے؟ کیوں صاحب میں کہتا ہوں آخر ہر شے اپنے مرتبہ ہی پر تو ہونی چاہیے۔ یہ مسئلہ تمام عقلاء کا مسلّمہ[6] ہے۔

دنیا و آخرت میں فرقِ مراتب ضروری ہے

جب یہ ہے تو دنیا اور آخرت میں فرق مراتب[7] ضروری ہے دونوں کو اپنے مرتبہ پر رکھو۔ دیکھیے ایک چیز تو ایسی ہو جو

---

[1] جس کا کوئی مقدمہ عدالت میں دائر ہو [2] پھلدار [3] نکلنا [4] کام کاج [5] حاصل کرنا [6] تسلیم کیا ہوا، مانا ہوا [7] درجوں کا فرق۔

صرف دس دن کام آوے اور دوسری چیز ایسی ہو جس کی عمر بھر ضرورت پڑے تو کیا دونوں کو ایک ہی مرتبہ پر رکھو گے؟ ہرگز نہیں۔ دیکھئے ایک تو مستقل رہنے کا مکان ہوتا ہے اور ایک سرائے ہوتی ہے کیا دونوں کے ساتھ ایک ہی سا معاملہ ہوتا ہے؟ مظفر نگر میں مقدمہ ہے یا اور کچھ کام ہے تو سرائے میں تین چار دن کے لیے قیام کرتے ہیں اگر وہاں کی چارپائی کی پٹی ٹوٹی ہوئی ہو تو پٹی تو بنوائیں گے مگر یہ نہ دیکھیں گے کہ سال[1] ہی کی ہوا اور رندہ بھی کی ہوئی ہو، اور چارپائی کا بان باریک ہو، اس کی بناوٹ میں پھول بھی پڑے ہوئے ہوں بہت سے بہت یہ ہوگا کہ ضرورت سے گذر کر آسائش[2] پر بھی نظر کرلیں گے کہ ذرا کسی ہوئی ہو قرسی نہ ہو، غرض ضرورت پر نظر ہوگی، زینت[3] پر نہ ہوگی کیوں کہ تین دن کا گھر ہے۔ ایک اپنا وطن ہے وہاں مکان بناتے ہیں تو اس میں چالیس پچاس ہزار روپیہ صرف کرتے ہیں نہایت عالیشان عمارت ہوتی ہے۔ اس میں زینت بھی، تجمل[4] بھی، سامان آسائش بھی سبھی کچھ ہوتا ہے تو اگر کوئی مظفر نگر کی سرائے میں اپنے وطن کے مکان کا سارا سامان وساز لاکر لگا دے اور سرائے کو سجا دے تو کیا نتیجہ ہوگا؟ یہی کہ اگلے دن سرائے کا نوکر اس کو نکال کر باہر کرے گا اور تمام جہان اس کو احمق کہیگا۔ کہ دیکھو اپنے اصلی گھر کے سامان کو چند روزہ سرائے کی نذر کر دیا۔ اب دیکھنا یہ چاہیے کہ ہمارا اصلی گھر کونسا ہے؟ ظاہر ہے کہ آخرت ہی ہمارا اصلی گھر ہے اگر آخرت

---

[1] ایک اعلیٰ قسم کی لکڑی کا نام ہے [2] آرام راحت [3] بناؤ۔ سنگار۔ سجانا سنوارنا [4] زیبائش، شان وشوکت

پر عقیدہ نہ بھی ہو تب بھی موت کا انکار تو ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھئے بعض فرقوں نے خدا کا بھی انکار کیا لیکن موت کا سب کو قائل[1] ہونا پڑا اور وہ بھی اختیار میں نہیں، کسی کو خبر نہیں کہ کب موت آجاوے؟ اور طوعاً و کرہاً[2] دنیا کو چھوڑنا پڑے۔ تو دیکھئے موت ایسی زبردست چیز ہے کہ اس کا سب کو قائل ہونا پڑا ہے، اور بالخصوص مسلمان کہ وہ تو موت کے بعد آخرت کی زندگی کے بھی قائل ہیں جو یقینی پیش آنیوالی ہے اور وہ زندگی بھی کیسی؟ اتنی طویل[3] کہ کبھی جس کا خاتمہ ہی نہیں، بس وہیں کی زندگی ہماری اصل زندگی ہے۔ اور وہی ہمارا اصلی گھر ہے۔ اس کا سامان ہمارے اعمال، ہمارا دین، ہماری طاعات[4] ہیں۔ ان کو ہم عارضی گھر یعنی دنیا جو وہاں کے مقابلہ میں سرائے سے بھی بدرجہا کم ہے۔ اس کے نذر کر رہے ہیں اور ہم نے جو کم کہا وہ اس لیے کہ فرض کیجئے۔ اگر گھر پر پچاس برس کی عمر ہوئی تو سرائے کے چار دن کو پچاس دن کے ساتھ کچھ تو نسبت ہے۔ لاکھوں کروڑوں کچھ تو حصہ ہوا آخر دونوں متناہی[5] ہیں۔ برخلاف اس کے دنیا اور آخرت میں اتنی بعید[6] بھی تو نسبت نہیں یعنی بہت سے بہت دنیا کی عمر ستر برس کی، اور ادھر آخرت کی ہزار کروڑ، سنکھ، مہا سنکھ، جتنا بھی گن سکیں گنئے لیکن اس سے بھی زیادہ طویل، وہاں کی عمر پھر اتنی بڑی عمر جس گھر میں گذارنی ہے اس کے سامان کو اس چند روزہ سرائے دنیا پر ہم لوگ نثار کر رہے ہیں۔ اس طرح کہ اگر کسی نے کوئی مکان تعمیر کرایا بس حلال حرام کی مطلق پروا نہ کی۔ ایمان بھی گھر میں لگا

---

[1] ماننے والا، اقرار کرنے والا [2] خوشی سے یا ناخوشی سے [3] لمبی [4] جمع طاعت یعنی عبادت بندگی [5] جس کی انتہا ہو، جو ختم ہو سکے۔

دیا، دین بھی سامان بہم پہنچانے میں صرف[1] کر دیا۔ نماز بھی اسی کے نذر کر دی، غرض بالکل ایسی مثال ہے کہ گھر کی ساری ریاست کو مظفر نگر کی سرائے میں لگا دیا، دوسرے، تیسرے دن سرائے کے بھٹیارہ نے کان پکڑ کر باہر نکال دیا، یہ تو حال ہے اور پھر اپنے کو سمجھتے ہیں کہ بڑے عاقل[2] ہیں کیسی ترقی کر رہے ہیں؟ کتنا بڑا مکان بنا ڈالا؟ اور اگر کوئی مولوی اس کی برائیاں بیان کرتا ہے تو اس کا نام زاہد خشک رکھا جاتا ہے اور ایسے مولویوں کو نئے نمازی، احدیوں کی پلٹن، نکمے، اپاہج، ضرورت زمانہ سے ناواقف، بیوقوف، بدتہذیب نہ معلوم کیا کیا لقب دیئے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ لوگ کسی کام ہی کے نہیں، ایک صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ مسلمانوں نے پانی سے بس صرف یہی کام لیا کہ وضو کر لیا، غسل کر لیا، طہارت کر لی، نہ بھاپ نکال کر مشینیں چلائیں نہ انجن ایجاد کئے۔ اس غفلت کی ان سے خدا تعالےٰ کے یہاں بازپرس[3] ہوگی۔ لو صاحب خدا تعالےٰ اس پر بھی مواخذہ[4] کریں گے کہ کلیں کیوں نہیں جاری کی تھیں۔ تو جنہوں نے سائنس سے کام لیا۔ بس انہیں نے خدا کی مرضی کو سمجھا۔ مسلمانوں نے کچھ بھی نہ سمجھا۔ خدا کی پناہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی[5] یہاں تک مذاق بگڑ گیا ہے کہ بس دنیا ہی کی ضرورت کو ضرورت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اعمالِ آخرت کے متعلق بھی پوچھتے ہیں کہ دنیا کا بھی کچھ نفع ہے یا نہیں؟ جیسے میں نے ابھی سب انسپکٹر کی حکایت بیان کی۔

شانِ مسلم

افسوس کتنی کایا پلٹ[6] ہو گئی ہے۔ حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیئے تھی کہ اگر اس کو کسی چیز میں دنیا کے نفع کی ترغیب

---

[1] خرچ کرنا۔ [2] عقل رکھنے والا۔ عقلمند [3] پوچھ گچھ کرنا، دریافت کرنا [4] پکڑ۔ گرفت۔ جواب مانگنا [5] پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ تعالےٰ سے [6] تبدیل۔ تغیر۔ بدل جانا۔

دیجاتی کہ بھائی اس میں دنیا کا یہ نفع ہے۔ فلانی غذا یا فلانی دوا بڑی طاقت بخش ہوتی ہے تو فوراً سوال کرتا کہ بھائی طاقت حاصل کر کے مجھے کیا کرنا ہے؟ یہ تو بتلاؤ کہ اس سے کچھ دین کا بھی بھلا ہوگا اور جب اس کو یہ بتلا دیا جائے کہ جب طاقت حاصل ہوگی تو عبادت کی قوت ہوگی اور پہلے سے زیادہ عبادت ہو سکے گی۔ تب کہیں جا کر راضی ہوتا کہ اگر یہ بات ہے تو لاؤ کھا لوں گا۔ آج یہ سوال ہوتا ہے کہ نماز روزہ کرنے میں کچھ ٹکے بھی ملیں گے؟ چنانچہ دنیا حاصل ہونے کے وظیفے اگر بتلائے جاتے ہیں تو ان کو نہایت شوق سے کیا جاتا ہے کیوں کہ ان میں یہ امید ہوتی ہے کہ ٹکے بھی ملیں گے۔ مجھ سے تو اگر کوئی بے نمازی دنیا کا وظیفہ پوچھتا ہے تو میں ایسا وظیفہ تجویز کر دیتا ہوں جس میں پانچوں نمازوں کے بعد پڑھنے کی قید ہو، تاکہ اسی بہانہ سے نماز کی پابندی نصیب ہو جاوے اور دنیا ہی کے طفیل میں آخرت کی طرف توجہ ہو جاوے، اسی طرح یہاں بھی ایسی ایک چیز حق تعالیٰ نے ہمیں بتلائی ہے۔ جس میں دین اور دنیا دونوں کا نفع ہے وہ چیز ذکر اللہ تعالیٰ ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ آیا اس کی ضرورت ہے یا نہیں؟ سو دین کی حیثیت سے اس کا ضروری ہونا تو ظاہر ہے دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کے اعتبار سے بھی ضروری ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ دیکھنی ہے کہ آیا یہ ضرورت کسی اور چیز سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یا نہیں؟ دنیا کے اعتبار سے اس کا ضروری ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا طالب ہے۔

درحقیقت سب لوگ ایک ہی چیز کے طالب ہیں

اور غور کر کے دیکھا جاوے تو سب لوگ

اپنی اپنی طلب میں محض صورۃً[1] مختلف ہیں معنیً[2] مختلف نہیں۔ دیکھئے ایک شخص اولاد کا طالب ہے وُہ چاہتا ہے کہ کسی طرح میں صاحبِ[3] اولاد ہو جاؤں۔ دوسرا کسی بڑے عہدہ کا طالب ہے وہ اس دُھن[4] میں ہے کہ کسی صورت سے میں ڈپٹی کلکٹر ہو جاؤں یا جج ہو جاؤں۔ تیسرا مال و دولت کی ترقی کا طالب ہے وہ اس فکر میں ہے کہ کسی تدبیر سے دو چار گاؤں ہاتھ آجائیں اور میں رئیس بن جاؤں ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس مکان بڑا عالیشان ہو جاوے ایک شخص ہے کہ وہ رات دن اسی کوشش میں ہے کہ میری حکّام[5] میں وقعت ہو جاوے آنریری مجسٹریٹ ہو جاؤں۔ درباروں میں کرسی ملنے لگے۔ غرض دنیا ہی کے مقاصد[6] کو دیکھ لیجئے کہ ان میں کس قدر اختلاف[7] ہے۔ کوئی کسی چیز کا طالب ہے کوئی کسی چیز کا اور لطف یہ کہ ہر شخص دوسرے کے مقصد کو بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ یہ بھی بھلا کوئی چیز طلب کرنے کی ہے؟ تو بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص ایک جُدا چیز کا طالب ہے لیکن درحقیقت یہ بات نہیں بلکہ ان مقاصد کے نام مختلف ہیں، معنی مختلف نہیں غور کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ جملہ[8] مقاصد محض صورۃً مختلف ہیں معنیً ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ درحقیقت یہ سب ایک ہی چیز کے طالب ہیں۔ اب سنئے وُہ چیز کیا ہے؟ اس کا نام ہے چین۔ بس ہر شخص چین ہی کا طالب ہے۔ جو شخص بے قرار ہے اولاد کے لیے وہ سمجھتا ہے کہ اولاد ہو جاوے گی۔ تو میرے قلب کو چین نصیب ہو جاوے گا۔ جو ترقی کا طالب ہے وُہ خیال

---

[1] صورت یعنی ظاہر کے اعتبار سے [2] معنی یعنی باطن کے اعتبار سے [3] اولاد والا [4] خیال [5] جمع حاکم حکم کرنے والا، فیصلہ کرنے والا [6] جمع مقصد۔ غرض [7] فرق تفاوت [8] تمام۔ سب۔

کرتا ہے کہ میرے پاس دس گاؤں ہو جاویں گے، تو مجھے چین حاصل ہو جاوے گا۔ غرض جو شخص جس چیز کا طالب ہے محض اسی لیے کہ اس کے مل جانے سے اس کے قلب کو سکون اور راحت ہو جاوے گی۔ خلاصہ یہ کہ چین اور راحت ہی کے سب طالب ہیں۔ لیکن اس راحت کے حصول[1] کے لیے اور ذرائع[2] ہر شخص نے اپنے زعم[3] کے موافق مختلف تجویز کر رکھے ہیں۔ غرض ان کا اختلاف محض نام کا اختلاف ہے۔ ورنہ[4] اصل کوئی اختلاف نہیں۔ ؎

اختلافِ خلق از نام افتاد چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

(نام کی وجہ سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا لیکن جب معنی تک رسائی ہو گئی یعنی معنی معلوم ہو گئے تو تمام اختلاف جاتا رہا اور اطمینان ہو گیا۔ (مثنوی دفتر دوم)

مقصد بالا کی توضیح کے لیے عجیب مثال

حضرت مولانا رومیؒ نے اس اختلاف کی ایک عجیب مثال دی ہے کہ ایک سفر میں چار شخص کہیں رفیق ہو گئے تھے چاروں مختلف ملکوں کے رہنے والے، ایک ترکی، ایک فارسی، ایک عرب اور ایک رومی۔ کسی نے ایک درم جو چوتھی کے برابر ہوتا ہے سب کی خدمت میں پیش کیا۔ سب کا انگور کھانے کو جی چاہا۔ لیکن لغت[5] مختلف بولے۔ عرب بولا میں تو اس درم کا عنب لوں گا۔ فارسی نے کہا نہیں میں انگور لوں گا۔ رومی نے کہا میں استافیل لوں گا۔ رومی زبان میں انگور کو استافیل کہتے ہیں۔ چوتھے نے اور کچھ کہا جو یاد نہیں، ترکی زبان میں انگور کو جو کچھ کہتے ہیں۔ غرض آپس میں جھگڑا

---

[1] حاصل ہونا [2] جمع ذریعہ۔ وسیلہ [3] ظن، گمان [4] اصل میں۔ حقیقت میں [5] زبان۔ لفظ

ترکی زبان میں انگور کو اوزم کہتے ہیں۔

ہونے لگا۔ ایک شخص آیا جو سب زبانیں جانتا تھا اس نے کہا کہ اچھا صبر کرو۔ اسی ایک درم میں تم سب کی چیز لیں خرید لاؤں گا۔ چنانچہ وہ درم لے کر بازار سے انگور خرید لایا۔ عرب سے کہا کہ یہ عنب ہے یا نہیں؟ اس نے کہا نعم[1]۔ فارسی سے کہا کہ یہ لو انگور ہے یا نہیں؟ اس نے کہا آرے[2] بیشک۔ اسی طرح سب نے اقرار کیا۔ انگور ہی سب کا مقصود تھا۔ لیکن لغت کے اختلاف سے اس کے نام مختلف ہو گئے تھے اسی مقام پر مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

اختلافِ خلق از نام اوفتاد　　چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

ایک نے اپنے مقصود کا نام اولاد رکھا، دوسرے نے جائداد، گاؤں ملکیت، تیسرے نے حکومت، عہدہ، اعزاز[3]۔

مقصود اصلی سب کا راحتِ قلب ہی ہے

لیکن معنیً مقصود سب کے ایک ہی ہیں یعنی راحت

ہر شخص بس راحت ہی کا طالب ہے۔ راحت کی طلب وُہ چیز ہے کہ اہلِ دنیا تو اہلِ دنیا اہلِ دین بھی اسی کے طالب ہیں۔ چنانچہ آخرت کی راحت کا مقصود ہونا ظاہر ہے۔ خلاصہ اس تمام تر تقریر کا یہ ہوا کہ ہر شخص کو بالذات[4] راحت اور چین ہی مقصود ہے گو بظاہر ہر شخص ایک مختلف چیز کا طالب نظر آتا ہو۔ ظاہر کا اختلاف تو یہاں تک ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص ایک چیز کا طالب ہوتا ہے اور دوسرا طالب ہوتا ہی اس چیز کے عدم[5] کا۔ کیوں دنیا میں ہر طرح

---

[1] ہاں [2] ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے [3] عزت مرتبہ [4] اپنی ذات کے اعتبار سے [5] نفی۔ وجود کا الٹ۔ نہ ہونا۔ نیستی

کے لوگ موجود ہیں۔ آزاد بھی، پابند بھی۔ بعض لوگ تو ایسے ہیں کہ انہیں کہیں سے مثلاً بیس ہزار روپے مل جاویں تو وہ زندہ ہو جاویں اور مارے خوشی کے پھولے[1] نہ سماویں۔ برخلاف اس کے دوسرے کو اگر اتنا روپیہ ایک ساتھ مل جاوے تو اسے تو ہونے لگے دہشت[2] کہ اتنے سارے روپیہ کو میں آخر کروں گا کیا۔ یہ کہاں کا بکھیڑا پیچھے لگ گیا؟ تو بظاہر ایک شخص بیس ہزار کا طالب ہے۔ دوسرا طالب نہیں بلکہ اس کے عدم کا طالب ہے۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ طالب ہے زر[3] کا نہ یہ بے زر ہی کا، دونوں راحت کے طالب ہیں۔ اسے راحت ہے زر میں، اسے راحت ہے بے زری میں۔ اسی طرح ایک شخص تو ایسا ہے کہ آنریری مجسٹریٹی اس کے سر مڑھی جاتی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ خدا کے لیے ہمیں معاف رکھو۔ ہمیں نہیں چاہیے آپ کی آنریری مجسٹریٹی، وہ سنتے ہی کانوں میں ہاتھ رکھتا ہے کہ للہ مجھے معافی دیجیے میں یہ جھگڑا اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔ دوسرا کوشش کر کے اس کو حاصل کرتا ہے اور حکام کی خوشامدیں کرتا پھرتا ہے۔ کہ کسی طرح یہ عہدہ مجھے مل جاوے۔ تو دیکھیے بظاہر دونوں متضاد[4] چیزوں کے طالب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت دونوں ایک ہی چیز کے طالب ہیں یعنی دونوں راحت کے طالب ہیں۔ اس نے دیکھا کہ راحت اسی میں ہے کہ اس بکھیڑے سے الگ رہوں کہاں کی مصیبت ہے خواہ مخواہ اپنا چین بھی کیوں کھویا۔ دوسرا اس میں راحت سمجھتا ہے کہ مجسٹریٹی مل جاوے گی تو خوب تماشہ

---

[1] بہت بہت خوش ہونا [2] نفرت [3] روپیہ۔ پیسہ مال و دولت [4] ایک دوسرے کے مخالف، ایک دوسرے کی ضد ہونا۔

مخلوق کا دیکھنے کو ملا کرے گا۔ طرح طرح کے مقدمے، قسم قسم کے معاملات لیجیے ایک کو تو اس میں راحت ہے کہ تماشۂ مخلوق کو دیکھے، ایک کو اس میں راحت ہے کہ کسی کا تماشہ نہ دیکھے۔

دعویٰ بالا کی امثلہ سے تشریح

حکام نے ایک مسلمان رئیس کو نظر بند کرنا چاہا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو؟ کہا میں تو مکہ میں رہنا چاہتا ہوں، چنانچہ اس کو مکہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں وہ رئیس کمبخت حج کے موسم میں بس سڑک پر کھڑا ہو جاتا اور عورتوں اور امردوں (بے ریش بچوں) کو تکا کرتا۔ ایک تو یہ حضرت تھے اور ایک وہ شخص ہے جو عورتوں اور امردوں سے بچنے کے لیے بستی کو چھوڑ کر جنگل میں رہنا اختیار کرتا ہے۔ ؎

بزرگے دید اندر کہسارے — نشستہ از جہاں در کنج غارے

میں نے ایک بزرگ کو پہاڑوں میں دیکھا کہ وہ دنیا سے الگ ہو کر ایک غار میں بیٹھا ہوا ہے۔

چرا نگذشتم بشہر اندر نیائی — ... ایک مصرع یاد نہیں آتا[1]

اس سے میں نے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے۔

بگفت آنجا پریرویاں نغزند — چوں گل بسیار شد پیلاں بغزند

اس نے جواب دیا کہ وہاں خوبصورت لوگ ہیں اور جب کیچڑ زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو ہاتھی بھی پھسل جاتے ہیں۔ (گلستان ج)

دیکھیے یہ کہتا ہے کہ اس میں راحت ہے کہ کسی کو نہ دیکھو اور وہ کہتا ہے کہ اس میں

---

[1] کہ بازی بندی از دل برکشائی۔

راحت ہے کہ سب کو دیکھو۔ یہ اور بات [illegible] کہ رائے کس کی صحیح ہے؟ اس کی اس وقت گفتگو نہیں۔ ابھی تو یہ [illegible] ہوں کہ ہر شخص دراصل راحت کا طالب ہے۔

اور لیجیے ایک خلق [illegible] خلافت سے گھبراتے تھے بعضے سلطنت کے لیے لڑتے مرتے ہیں [illegible] حاصل کرنے کے لیے باپ کو مار ڈالا۔ کسی نے بھائی کو قتل کر دیا۔ اُن [illegible] میں راحت۔ ان کو اس میں گو ایک کی راحت خیال ہی ہو اور سنیے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ؎

زاہد نداشت تابِ جمالِ پری رُخاں ٭ کنجے گرفت و ترسِ خدارا بہانہ ساخت

عبادت گزار میں خوبصورتوں کے جمال کی تاب و برداشت نہ تھی لہذا اس نے تنہائی اختیار کی اور خدا کے خوف کو بہانہ بنایا۔

باہر نکلتے ہیں تو حسینوں پر نظر پڑتی ہے جس سے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں کہاں کی مصیبت ہے عافیت تو اسی میں ہے کہ کونہ میں بیٹھ رہو، اسی گوشہ نشینی کو کسی دوسرے پیرایہ میں شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

آنانکہ بہ کنجِ عافیت بہ نشستند ٭ دندانِ سگ و دہانِ مردم بستند

جن لوگوں نے تنہائی اختیار کر لی تو انہوں نے کتوں کے دانتوں اور لوگوں کے منہ کو بند کر دیا۔

کاغذ بدریدند و قلم بشکستند ٭ وز دست و زبانِ حرف گیراں رستند

کاغذ کو پھاڑ ڈالا اور قلم کو توڑ دیا اور اعتراض کرنے والوں کی زبان اور ہاتھ سے چھٹکارا پایا۔

اسی طرح بعضے روپیہ پیسہ کے عاشق ہوتے ہیں اور بعضے ایسے ہیں کہ وُہ اس کے ذکر سے بھی گھبراتے ہیں۔

حضرت سلیم چشتیؒ کے زہد وفہم کی حکایت

حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی
کی خدمت میں شاہجہاں بادشاہ
ایک مرتبہ حاضر ہوا اور ایک بہت بڑی [illegible] کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں
اس کو لے کر کیا کروں گا؟ ا[illegible] کچھ نہیں پھر جو کچھ تھوڑی بہت حاجت
ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مجھے بھجوا [illegible] میں اسے لے کر آخر کروں گا کیا؟
شاہجہاں کے دل میں انکار سے شاہ صاحب کی بڑی وقعت ہوئی، ایک مولوی
صاحب ہمراہ تھے ایسے حضرات پر خشک ذی علم (علم والوں) کو حسد ہوتا ہی ہے
انہوں نے سوچا کہ ان کی تو بادشاہ کی نظر میں بڑی وقعت ہوگئی۔ لاؤ ان میں
کوئی عیب نکالو۔ عیب نکالنے میں ایسے لوگ بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ جس وقت
شاہ صاحب نے انکار کیا آپ کہتے ہیں قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَشِیْبُ الْمَرْءُ وَیَشِبُّ فِیْہِ خَصْلَتَانِ الْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ[1]
جناب رسول اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آدمی بوڑھا ہوتا ہے اور اس کے اندر دو[2]
خصلتیں جوان ہوتی ہیں حرص اور طول امل۔ آپ بوڑھے ہیں لہٰذا آپ میں یہ
دونوں خصلتیں ہونا لازمی ہے۔ کیوں کہ حدیث کا غلط ہونا محال ہے۔ لہٰذا
یہ آپ کا تصنع[3] ہے۔ کہ باوجود حرص کے روپیہ لینے سے انکار کر رہے ہیں شاہ
صاحب حرف شناس (پڑھے لکھے) بھی نہ تھے۔ لیکن سبحان اللہ کیا دندان شکن
جواب دیا ہے فی البدیہہ فرمایا کہ مولانا آپ حدیث کا مطلب ہی نہیں سمجھے،

---

[1] یَھْرَمُ ابْنُ اٰدَمَ وَیَشِبُّ مِنْہُ اِثْنَانِ الْحِرْصُ عَلَی الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَی الْعُمُرِ
(مشکوٰۃ باب الحرص والامل)، [2] مشکل [3] بناوٹ۔

نرے پڑھنے سے کیا کام چلتا ہے [illegible]
" مولوی گشتی [illegible] "

(ترجمہ : مولوی تو بن گئے مگر آگاہ اب [illegible])

حضور علیہ السلام نے " یَشِیبُ " فر[illegible] ہی ہوگا جو پہلے سے پیدا ہوا ہو۔ یہاں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تعالیٰ میر[illegible] ہی پیدا ہی نہیں ہوئی جو آج جوان ہوتی۔ تم اپنی خبر لو کہ شروع ہی سے حرص تمہارے اندر پیدا ہوئی اور پرورش ہوتے ہوتے اب اس پر جوانی کا عالم ہے۔ دیکھو آج تمہارے بڑھاپے میں اس پر کیا جوبن چڑھ رہا ہے؟ میرے اندر تو بفضلہٖ حرص کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی جو آج بڑھاپے میں اس کے جوان ہونے کی نوبت آتی۔ اللہ اکبر کیا گہری بات فرمائی ہے؟ علم حقیقی ان ہی حضرات کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مولوی صاحب سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ شاہ صاحب کا بس منہ دیکھ کر رہ گئے، بہر حال ایک وہ لوگ بھی ہیں جو روپیہ پیسہ سے گھبراتے ہیں۔

حضرتِ غوثِ پاکؒ کی دنیا سے بے رغبتی

لیجیے ایک اور حکایت یاد آئی۔ حضرت سیدنا غوثِ پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بادشاہِ سنجر نے عریضہ لکھا کہ ایک حصہ میرے ملک کا ہے نیمروز، وہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں کیوں کہ آپ کی خانقاہ کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ مہمانوں کی کثرت رہتی ہے، واردین صادرین کثرت سے آتے رہتے ہیں۔ حضرت غوثِ پاکؒ اس کے جواب میں نہایت بے پروائی کے ساتھ لکھتے ہیں ؎

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد   در دِل اگر بود ہوسِ مُلکِ سنجرم

(اگر میرے دِل میں ملکِ سنجر کی خواہش ہو تو بادشاہِ سنجر کی چھتری کے میرے نصیبہ کا چہرہ سیاہ ہوجائے (بادشاہِ سنجر کا چتر سیاہ ہوتا تھا)

زانگہ کہ یافتم خبر از مُلکِ نیم شب   من مُلکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

(جس وقت سے مجھ کو آدھی رات کی بادشاہت کی خبر ملی ہے میں نیمروز کے ملک کو ایک جَو کے عوض بھی نہیں خریدتا۔ (نیمروز ایک حصۂ ملک کا نام ہے)

یعنی آدھی رات کو اٹھ کر جو نفلیں پڑھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوتا ہوں اس کے لطف کے سامنے سب گرد ہیں، حکومت اور سلطنت میں تمہارے ملکِ نیمروز کو ایک جَو کی برابر بھی نہیں۔ حضرت تو وہ کیا بات ہے؟ ان کو اسی میں چین ملتا تھا۔

تو دیکھئے ظاہر میں سب کے الگ الگ مطلوب[1] ہیں۔ لیکن حقیقت میں سب ایک ہی چیز کے طالب ہیں یعنی چین کے۔ یہ دوسری بات ہے کہ واقعی چین کس میں ہے؟ جو آگے ثابت ہوجاوے گا۔ جب یہ بات ہے تو دُنیا کے طالب بھی واقعی چین ہی کے طالب ہیں تو چین دنیوی ضرورت کی بھی چیز ہوئی، کوئی ایسا نہیں جس کو چین اور راحت مطلوب نہ ہو۔ رہی آخرت، سو آخرت کے چین کا مطلوب ہونا بالکل ظاہر ہے۔ کسی کو اس میں کلام ہی نہیں۔ بفضلہٖ ایک مقدمہ تو بخوبی ثابت ہوگیا کہ چین دنیا اور آخرت دونوں کی ضرورت کی چیز ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ باقی رہا کہ چین کس چیز میں ہے؟ سو حق سبحانہٗ تعالےٰ دعوے

---

[1] جس کو طلب کیا گیا ہو۔

فرماتے ہیں کہ خُدا ہی کی یاد میں چین منحصر ہے جب یہ ہے تو اَب ذکر کے ضروری ہونے میں کیا شُبہ رہا؟

چین صرف ذکر اللہ سے مِلتا ہے

اَب میں اس کو ثابت کرتا ہوں کہ چین صرف ذکر اللہ تعالیٰ ہی میں ہے۔ سو یہ بات مشاہدہ سے معلوم ہو سکتی ہے کہ دنیا دار ہرگز راحت میں نہیں۔ ٹٹول لیجئے طالبان راحت اَور اسباب راحت جمع کرنے والوں کو۔ یعنی ایک وُہ شخص ہے کہ جس کی عمر گذر گئی سامان راحت جمع کرنے میں اَور سامان جمع بھی ہو گیا لیکن راحت پھر بھی کہاں نصیب؟ اوّل تو سب سامان جمع ہوتا نہیں، حق تعالےٰ کا ارشاد ہے اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ۝ (کیا انسان کو وہی مِل جاتا ہے جس کی وہ تمنّا کرتا ہے) القرآن پ۲۷۔ عربی شعر ؎

مَا کُلُّ مَا یَتَمَنَّی الْمَرْءُ یُدْرِکُہٗ ؛ تَجْرِی الرِّیَاحُ بِمَا لَا تَشْتَہِی السُّفُنُ

(ہر وہ چیز جس کی انسان تمنّا کرے اسے نہیں پالیا کرتا، کبھی ہوائیں کشتیوں کی خواہش کے خلاف چلتی ہیں) یعنی کبھی ہوائیں مخالف ہوتی ہیں جو کشتی کے مقتضا کے خلاف ہے۔ بالفرض اگر ہر شخص اپنی سب تمنّائیں حاصل بھی کرے تب بھی راحت نہیں، یعنی فرض کرو ایک شخص ایسا ہے کہ اس کی سب تمنّائیں پوری ہو گئیں، یعنی جسے وہ سامانِ راحت سمجھتا تھا وُہ سب جمع ہو گیا۔ لیکن خود راحت تو خدا ہی کے قبضہ میں ہے۔

راحت اَور چیز ہے سامانِ راحت اَور چیز

یعنی دیکھنا یہ ہے کہ سعی سے کیا چیز جمع

لے آرام چاہنے والے

ہو سکتی ہے۔ راحت یا سامانِ راحت؟ ایک شخص ہے کہ اس کا عہدہ بھی بڑا ہے، گاؤں بھی ہیں، نوکر چاکر بھی ہیں، حشم خدم[1] بھی ہے، حکومت بھی ہے غرض راحت اور عیش کا سارا سامان جمع ہے، اوّل تو بہت کم ایسے ہوتے ہیں لیکن خیر آخر کوئی ایسا ہو بھی تو اس کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی حالت دیکھئے اور تفتیش کیجئے کہ آیا اُسے چین میسر ہے یا نہیں، میں سچ عرض کرتا ہوں چین پھر بھی اسے نصیب نہیں۔ کوئی نہ کوئی پریشانی وہاں ضرور پاؤ گے۔ اپنی عمر میں کوئی دنیادار آرام میں نہیں۔ ایک شخص ہے کہ اس کے اولاد نہیں ہوتی، مدتوں تو اس غم میں رہا کہ اولاد نہیں ہوتی، خیر اولاد بھی ہو گئی تو پھر اولاد کے اولاد نہیں ہوتی۔ اب اس غم میں ہے غرض کسی وقت فکر و غم سے خالی نہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ اہلِ دنیا کے نزدیک بھی مشہور ہے۔

کسی مجرد (غیر شادی شدہ) شخص نے کسی عیالدار[2] سے پوچھا کہ خیریت بھی ہے اس نے بگڑ کر کہا کہ میاں خیریت ہوگی تمہارے یہاں کہ نہ گھر نہ بار، اکیلی جان آخر نکھٹو ٹھہرے، بس خیریت ہے، ہمارے یہاں کیوں خیریت ہونے لگی؟ خیریت ہوتی ہے تم جیسے منحوسوں کے یہاں۔ ہمارے یہاں تو اللہ کے دئیے ہوئے بیوی بچے، پوتے پڑپوتے، نوکر چاکر، سبھی ہیں، کسی کا سر دکھ رہا ہے، کسی کو دست آ رہے ہیں، کسی کی آنکھ دکھ رہی ہے، ہمارے یہاں کیسی خیریت۔ تم اکیلے اپنی جان سے ہو اس لیے تمہارے یہاں ہمیشہ خیریت ہی خیریت ہے۔ خدا نہ کرے وہ دن کہ ہمارے ہاں ایسی خیریت ہو، سو

---

[1] خدمت گار لوگ۔ [2] بیوی بچے رکھنے والا۔

واقعی بالکل سچ ہے کہ جتنا سامان بڑھتا ہے، غم بھی بڑھتا جاتا ہے۔

گلستان میں ایک حکایت ہے کہ کسی فقیر کو بادشاہت مل گئی تھی۔ کسی نے مبارک باد دی تو اُس نے کہا کہ میاں مبارکباد کاہے کی دیتے ہو،

"دی روز غم نانے داشتم امروز غم جہانے"

(ترجمہ کل تک صرف اپنے کھانے کی فکر تھی، مگر آج تمام جہان کا غم مجھ پر سوار ہے۔)

بچوں کو لوگ کہا کرتے ہیں کہ بادشاہ ہیں۔ سُبحانَ اللہ بادشاہی کی حقیقت بچپن کے زمانہ کے سامنے کیا ہے۔ بادشاہوں کو تو ہم سے بھی زیادہ فکریں ہیں۔ اُن سے تو غریب ہی زیادہ بے فکر ہیں اور بچے تو بالکل ہی بے فکر ہوتے ہیں۔ اُن سے بھلا نسبت ہی کیا بادشاہوں کو؟ خلاصہ یہ کہ جتنا سامان بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی پریشانی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ خوب فرماتے ہیں ایک بزرگ ؎

وَمَنْ يَحْمَدُ الدُّنْيَا لِعَيْشٍ يَسُرُّهُ ۔۔۔ سَوْفَ لَعَمْرِيْ عَنْ قَلِيْلٍ يَلُوْمُهَا

(جو شخص دنیا کی تعریف اُس آسائش کی وجہ سے جو اُسے خوش کئے دیتی ہے کر رہا ہے میری جان کی قسم وہ جلد ہی اس کی مذمت و برائی بھی ضرور کرے گا۔

یعنی جو آج ترقی کی ترغیب دے رہا ہے واللہ وہ بہت جلد خود اس کی مذمت کرے گا۔ ؎

إِذَا أَدْبَرَتْ كَانَتْ عَلَى الْمَرْءِ حَسْرَةً ۔۔۔ وَإِنْ أَقْبَلَتْ كَانَتْ كَثِيْرًا هُمُوْمُهَا

(اس کی حالت یہ ہے کہ جب یہ چلی جاتی ہے تو آدمی کو حسرت و رنج دے کر جاتی ہے اور جب آتی ہے۔ تو بہت سے افکار ساتھ لے کر آتی ہے۔)

دُنیا ایسی چیز ہے کہ جب یہ آتی ہے تو سینکڑوں پریشانیوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے

اور جب یہ جاتی ہے تو حسرت اور افسوس چھوڑ جاتی ہے، نہ اُس کا آنا پریشانی سے خالی، نہ اُس کا جانا پریشانی سے خالی۔ شروع سے آخیر تک بس پریشانی ہی پریشانی ہے۔ سو واقعی حضرت خدا تکلیف سے بچاوے۔ دُنیا ہو مگر بقدرِ ضرورت لیکن اس کا زیادہ ہونا تو بس پوری مصیبت ہے۔ مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ دے دیا تو بس قبضہ میں آتے ہی سبق شروع ہو گیا۔ اب اس کی حفاظت کی فکر میں ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔ غرض اُس کے آتے ہی پریشانی تو نقد موجود ہے۔ چور صاحب چاہے اگلے ہی دن ساری کی ساری رقم ایک ساتھ اڑا لیجاویں اور ان صاحب کو اُسے برتنے کا موقع بھی نہ ملے۔ پھر اس کے چوری جانے کے بعد جو غم اور پریشانی ہوئی وُہ نفع میں رہی۔

جیسے مشہور ہے کہ ایک چور کسی کا گھوڑا چرا کر لایا۔ راستہ میں ایک اور چور ملا جو اُس سے بھی زیادہ شاطر (چالاک) تھا۔ اُس نے پوچھا کہ میاں گھوڑا بیچتے ہو؟ انہیں بھلا ایسا موقع کہاں ملتا کہ اِدھر چرا کر لائے اُدھر خریدار موجود۔ پکڑے جانے کا بھی کھٹکا نہ رہے۔ کہا ہاں بیچتے تو ہیں۔ دوسرے چور نے کہا کہ بھائی پہلے سوار ہو کر دیکھ لیں کہ کوئی عیب تو نہیں، لو تم میری جوتیاں تھام لو میں آٹھ دس قدم اِسے چلا کر ذرا دیکھ لوں۔ جوتیاں تو اس کے ہاتھ میں دیں اور رکاب میں پاؤں رکھ، اوپر چڑھ، ایڑ ماریہ جا اور وہ جا۔ چور صاحب جوتیاں ہاتھ میں لیے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ کسی نے پوچھا میاں جو تم گھوڑا لیے جا رہے تھے وُہ کیا ہوا؟ کیا بیچ دیا؟ کہا ہاں بیچ دیا۔ پوچھا کتنے میں گیا۔ کہا جتنے میں لائے تھے اتنے میں گیا۔ اور یہ جوتیاں نفع میں رہیں۔ مفت لیا تھا مفت گیا۔ جوتیاں نفع میں ملیں۔ خیر بھاگتے

چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ اسی طرح دُہ ایک ہزار روپے کیا آئے ایک مصیبت اپنے ساتھ لائے اور گئے تو ایسی برکت کر گئے کہ ایک تو روپیہ جانے کا اوپر سے یہ پریشانی مفت کی کہ پولیس میں رپٹ لکھواؤ۔ مستغیث (فریاد کرنے والا۔ استغاثہ دائر کرنے والا) نہ بنو تو جرم اور بنو تو سینکڑوں جھگڑے۔ ایسے موقعوں پر بعضی پولیس الٹا مستغیث سے وصول کرتی ہے۔ نہ دو تو رپٹ کو جھوٹا قرار دیکر الٹا مستغیث کا چالان کر دے، یہ پریشانی اور پولیس کا خوف گھاٹے میں رہا۔ جیسے اُس چور کو جوتیاں نفع میں رہی تھیں۔ بڑے جوتے تو یہ ہیں کہ ہزاروں طرح کے غم۔ روپیہ کے آنے کی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی جتنا کہ جانے کا غم ہو گیا۔ رات بھر تو حفاظت کی فکر میں چین نہ آیا، اور صبح دیکھتے ہیں۔ تو صندوقچہ ندارد[1]۔ میں اپنی ہی کہتا ہوں۔ میرے پاس کوئی چیز ہدیہ آتی ہے تو آتے ہی بس یہ غم سوار ہو جاتا ہے کہ اس کو کس مصرف میں لاؤں، جب تک اس کی ضرورت ذہن میں نہیں آجاتی ہمیشہ اس کی فکر رہتی ہے، کہ کہاں استعمال کروں۔ ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں حق تعالیٰ کی ناشکری نہ ہو۔ کہ نالائق ہم تو تجھے دیتے ہیں اور تو گھبراتا ہے۔ بعضی چیز تو خیر ایسی ہوتی ہے کہ آتے ہی کام میں آجاتی ہے۔ لیکن بعض چیز ایسی آتی ہے کہ سوچنا پڑتا ہے۔ کہ آخر اس کا کیا کروں؟ یا تو کسی کو دیدی یا اگر بخل کا غلبہ ہوا تو سوچا کہ اجی مفت کسی کو کیوں دیں لاؤ بیچو جی۔ چنانچہ بیچ کر دام کھرے کر لیے اور ضروری موقعوں پر خرچ کر لیا۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ اُس کا موجود رہنا بھی تو بار[2] ہوتا ہے۔

---

[1] نہیں رکھتے یعنی غائب ہے [2] بوجھ

صحیح الحس آدمی زائد از ضرورت سامان سے گھبراتا ہے

میں دیکھتا ہوں کہ گھروں میں کثرت سے سامان بھرا پڑا ہے اور اس کے استعمال کی کبھی عمر بھر بھی نوبت نہیں آتی۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ قلب پر ایسے فضول سامان کا بار ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو میں ضرور کہوں گا کہ قلب بیحس ہو گیا ہے۔ ورنہ ضرور الجھن ہوتی۔ مجھے تو اس تصور ہی سے وحشت ہوتی ہے کہ میری ملک میں بھی ضرورت سے زیادہ چیزیں ہوں، چاہے اُن چیزوں سے خود مجھے کبھی بھی سابقہ نہ پڑتا ہو، لیکن یہ خیال ہوتا ہے کہ میری ملک میں بھی ایسی فضول چیزیں کیوں ہوں؟ آخر ان کا ہو گا کیا؟ طبیعت بہت ہی الجھتی ہے کہ جو چیز کام میں نہ آوے وہ گھر میں کیوں رہے۔ مفت میں پہرہ چوکی دینا، حمال[1] ہونا، مزدور بننا، فضول کا دردسر۔ خوب کہا ہے صائب نے ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

(اے صائب حرص کی وجہ سے قناعت نہیں حاصل ہوئی ورنہ دُنیوی اسباب سے جن کو ہم اپنے استعمال میں رکھتے ہیں ان میں کے اکثر غیر ضروری ہیں)، واقعی ہر شخص ٹٹول کر دیکھ لے کہ جتنی چیزیں گھر میں موجود ہیں ان میں سے اکثر کی تو کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ بعض اوقات تو چیز کے آنے پر ضرورت تصنیف کی جاتی ہے کہ فلانے کام میں لگائیں گے۔ چیز کیا آئی ایک اور کام بڑھ گیا۔ اب تک جو شغل نہ تھا۔ لیجئے آج وہ شغل بھی تیار ہے۔ اے اللہ جن کے یہاں سامان بے حد بھرا پڑا ہے،

---

[1] بوجھ اٹھانے والا۔

نہیں کیسے چین آتا ہوگا؟ وہ سامان کہ جس کی فہرست بھی نہیں کہ کیا کیا چیز ہے اور جس کی خبر بھی نہیں کہ کہاں پڑا سڑ رہا ہے؟ اور جو اس طرح حاصل کیا گیا تھا کہ کسی کا گلا کاٹ کر، کسی کا حق مار کر، سینکڑوں گناہ سمیٹ کر وہ آج یوں بیکار پڑا گو کھا رہا ہے۔ یونہی پڑا پڑا دیمک لگ لگ کر ختم ہو گیا اور مالک صاحب کو پتہ بھی نہیں۔ ایچولی ضلع میرٹھ میں ایک دولہن جہیز میں پندرہ سَو کے کپڑے لائی تھی، بھلا کس کام آویں گے؟ اُن سب کے استعمال کی بھی کبھی نوبت نہ آوے گی۔ کیوں کہ وُہ تو اتنے ہیں کہ پر نواسی بلکہ سگر نواسی تک بھی ختم نہ ہوں۔ بس ہمیشہ ہوا اور دھوپ دیا کرو اور پھر ویسے کے ویسے ہی بند کر کے رکھ دو بھلا کیا فائدہ نکلا سوا اس کے کہ ایک شغل بڑھ گیا۔ لو صاحب یہ ابا جان نے سلوک کیا کہ ایک اچھی خاصی مصیبت عمر بھر کے لیے جان کو لگا دی۔ یہ ہے زیادہ اسباب کی خرابی۔

یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی حِس ہی باطل ہو گئی ہو اور اس کو یہ مصیبت مصیبت ہی نہ معلوم ہوتی ہو۔ جیسے حِس باطل ہو جاتی ہے کوکین سے، جیسے کوکین کو کھاتے کھاتے زبان بے حِس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چوں کہ خرافات کے عادی ہو رہے ہیں اس لیے قلب بے حِس ہو گیا ہے۔ لیکن ایک وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ سُن اُترے گی۔ اس وقت یہ افکار سانپ اور بچھو کا کام کریں گے وہ وقت کون سا ہوگا؟ وُہ وقت ہوگا موت کا۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا انْتَبَھُوْا" (لوگ سو رہے ہیں۔ جب مریں گے تو خبردار ہونگے) حضرت مرتے وقت آنکھ کھُلیگی۔ اس وقت ادراک درست ہوگا۔ اس وقت

معلوم ہو گا کہ یہ غم جائداد کا، ساز و سامان کا، گھر بار کا، لیکن فضولیات کا نہ کہ ضروریات کا کیسا ستاتا ہے۔ اُس وقت احساس ہو گا کہ قلب پر اُن کی جدائی سے کس قدر بار اور گرانی ہوتی ہے۔ کوئی غم سانپ کی خاصیت رکھیگا۔ کوئی بچھو کی خاصیت کہ ہائے میں چلا ہائے یہ ساری چیزیں مجھ سے چھوٹیں، ہائے میرے بعد نہ جانے ان کا کیا حال ہو گا۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ۝ (اور ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ لپٹ جاتی ہے اُس روز تیرے رب کی طرف جانا ہوتا ہے۔) سورۃ القیٰمۃ ع۲ خدا بچائے جس نے تعلقات ضرورت سے زیادہ بڑھا رکھے ہیں اور انہیں میں رات دن انہماک[1] ہے اُس کو مرنے کے وقت سخت کشاکشی[2] پیش آنے والی ہے۔ سانپ بچھوؤں کا عذاب قبر میں تو ہو ہی گا اُس کا نمونہ مرنے کے وقت دنیا ہی میں دیکھ لے گا۔ جن صاحبزادہ کے واسطے جائداد چھوڑ جانیکی فکر میں حلال حرام کی تمیز نہ کی وہ خوش ہیں کہ ابا مر رہے ہیں خوب گلچھرے اڑاویں گے۔ باوا جان کی مصیبت ہے کہ چاروں طرف کے خیالات سانپ بچھو بن کر لپٹ رہے ہیں لیکن اے صاحب آپ ہی نے تو یہ سانپ بچھو لپیٹے ہیں خود بخود تو جمع نہیں ہو گئے۔

میں پھر کہے دیتا ہوں اور بار بار کہے دیتا ہوں کہ یہ سب تقریر فضولیات کے متعلق ہے۔ ضروریات اس سے بالکل مستثنےٰ ہیں۔ لیکن ضروریات وہ جو واقعی ضرورت ہو، تصنیعی (بناوٹی) ضرورت نہیں۔ یعنی بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے پاس وہ چیزیں نہیں ہیں ان کا ان کے بغیر کچھ بھی حرج نہیں۔ بعض چیزوں کے تو نام بھی ہمیں نہیں معلوم مثلاً جواہرات ہمارے پاس نہیں ہیں تو بدوں ان

[1] حد سے زیادہ مشغول ہونا۔ [2] کھینچا تانی۔

کے ہمارا کون سا کام اٹکا ہوا ہے اُن کے حصول کے درپے ہونا کیا فضول حرکت نہیں؟ البتہ جو چیز فضول نہیں ان سے ہم تعرض[1] نہیں کرتے، اَب تقریبات میں جو محض نام[2] و نمود اور شان و شوکت کے لیے فضولیات تصنیف کیں پھر ان کے پورا کرنے کے لیے جائز و ناجائز بٹورنا شروع کر دیا۔ پھر اسی طرح سلسلہ وار لاکھوں ضرورتیں اپنے سر لیٹالی ہیں۔ جن میں کی ہر چیز عذاب ہے۔ اسی کو حق تعالےٰ فرماتے ہیں:۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (آپکو خوشنما نہ معلوم ہوں اُن کے اموال و اولاد۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ یوں چاہتا ہے اولاد و اموال سے انہیں دُنیا ہی میں عذاب دیں۔ سورۃ التوبہ ع ۱۳) یعنی آپکو خوشنما نہ معلوم ہوں ان کے اموال و اولاد، کیونکہ اللہ تعالےٰ یوں چاہتا ہے کہ اولاد و اموال سے انہیں دُنیا ہی میں عذاب دیں، آخرت میں تو عذاب الگ ہوگا، دنیا ہی میں عذاب ہو جاوے۔ حقیقت میں مال اور اولاد دنیا داروں کے لیے عذاب ہی ہے۔ بعضوں کو تو مال کی حفاظت کی فکر میں سونا نصیب نہیں ہوتا، جیسے سانپ خزانہ پر جاگتا ہے ویسے ہی یہ لوگ رات بھر جاگتے ہیں۔ اس بہانہ سے تہجد بھی شروع کر دیا۔ ذکر و شغل بھی کر رہے ہیں اور غرض وہی ہے یعنی حفاظتِ مال۔ اگر آج سارا ذخیرہ جاتا رہے تو پھر تہجد بھی ختم، پھر کہاں کا ذکر اور کس کا شغل؟ تو رات بھر خود اس طرح جاگ جاگ کر پہرہ دیتے ہیں، کیوں کہ چوکیداروں پر بھی کیا بھروسہ؟ اگر جائیداد ہوئی تو مقدمہ بازی سے فرصت نہیں۔ کبھی تو اس کی فکر کہ فلانے نالش (شکایت)

---

[1] اعتراض کرنا [2] دکھاوا۔ نمائش

کر دی، پیروی میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک جگہ جیتے دوسری جگہ ہارے اسی طرح ہائی کورٹ پہنچتے پہنچتے ہزاروں کے وارے نیارے ہو گئے۔ اگر ہائیکورٹ تک پہنچ کر آخیر میں نالش خارج بھی ہو گئی تب بھی میاں کا پورا کورٹ تو ہو ہی گیا کبھی اس کا غم کہ ہائے اتنا تو خرچ کیا پھر بھی اپیل خارج۔ غرض ہر طرح مصیبت ہے اور ہر وقت کی مصیبت ہے۔ ع "چو میرد و مبتلا میرد چو خیزد و مبتلا خیزد" (جب مرتا ہے تو اپنے خیالات میں آلودہ مرتا ہے اور جب اٹھتا ہے تو اپنے خیالات میں آلودہ اٹھتا ہے۔) یہی اولاد کی کیفیت ہے۔ اوّل تو مدّتوں کی آرزوؤں کے بعد خدا خدا کر کے اولاد ہوئی پھر کوئی بچہ بیمار ہوا یہاں تک کہ مایوسی تک نوبت پہنچ گئی۔ اب پریشان ہیں کہ اے اللہ کیا ہوگا؟ اگر یہ مر گیا تو میں کیوں کر زندہ رہوں گا؟ ہائے کیا حال ہوگا۔ قبل از مرگ واویلا[1]۔ مرنے کا اتنا غم بھی نہ ہوگا۔ جیسی تکلیف اس سوچ میں ہے کہ ہائے اگر مر گیا تو کیا ہوگا؟ غرض کسی طرح چین نہیں، ہر وقت بے چین ہیں، پریشان ہیں۔ یہ مزا ہے اولاد کا اور اموال کا۔ فرمائیے یہ مصیبت ہے یا نہیں۔

اسی کو فرماتے ہیں: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ اموال و اولاد کی کثرت دنیا ہی میں آلۂ عذاب ہے جس کے پاس مال اور اولاد کی کثرت ہے اس کی حالت ہی یہ ہے کہ ہر وقت ایک عذاب جان میں مبتلا ہے۔ پھر بتائیے کیا ایسے شخص کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ چین میں ہے؟ ہرگز نہیں۔ دنیا دار کوئی چین میں ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک مطلب خیز حکایت

میں نے ایک حکایت نہایت مطلب خیز اور میرے اثبات[2] مدّعا میں بہت واضح اور صریح[3] اپنے استاد

---

[1] موت سے پہلے ہی چیخنا چلانا [2] جس سے مطلب نکل سکے [3] مدّعا کو ثابت کرنا [4] صاف۔ صاف

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سُنی ہے کہ کسی شخص کو جو دِلّی کا رہنے والا تھا حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کی بڑی تمنا تھی۔ کیوں کہ سُنا تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام بڑے مقبول الدعوات ہیں اُن سے دُعا کرائیں گے، بعضوں کو یہ خبط بھی ہوتا ہے اور اس خبط میں ان کی حیات اور موت کو پوچھتے ہیں۔ چنانچہ جب میں دیوبند میں پڑھتا تھا ایک صاحب کا خط مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں آیا تھا۔ اُس میں انہوں نے پوچھا تھا کہ آیا حضرت خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں مولوی صاحب تھے، بڑے زندہ دِل، جواب لکھوایا کہ بھائی انکا میرے پاس بہت دن سے کوئی خط نہیں آیا خبر نہیں آئی۔ زندہ ہیں یا مر گئے۔ بہت دن سے خیریت نہیں آئی۔ جب کوئی خط آوے گا تو اطلاع دوں گا، لوگ بھی کیا فضول فضول سوال کرتے ہیں۔

ہمارے لئے تو سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں

اجی مطلب کیا ہمیں اس تحقیق سے ہمارے خضرؑ اور ہمارے عیسیٰؑ تو جناب رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی وہ شان ہے کہ اگر اس زمانہ میں سارے انبیاء دوبارہ دُنیا میں تشریف لے آویں تو سب کے سب آپ ہی کے امتی ہو کر رہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان سے تشریف لاویں گے تو ہمارے حضور ہی کی شریعت کے تابع ہوں گے، پھر بھی افسوس ہے کہ ہم کو خضر علیہ السلام کی ڈھونڈ ہے۔ بس ہمیں تو ہمارے حضور (علیہ السلام) ہی کافی ہیں، ہمیں کسی کی تلاش نہیں چاہیئے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت خضر علیہ السلام خود ایک بار تشریف لائے اور مصافحہ کیا۔ مصافحہ

لے جمع نبی

کر کے حضرت ابراہیم بن ادہم اپنے کام میں مشغول ہو گئے یعنی اللہ تعالےٰ کی یاد میں حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں، حضرت ابراہیم بولے کہ میں نے اس کی کچھ ضرورت نہیں سمجھی، انہوں نے فرمایا کہ میں خضرؑ ہوں آپؒ نے فرمایا ہونگے یہ کہہ کر پھر مشغول ہو گئے، حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ بھائی تم تو بڑی بے پروائی سے ملے۔ لوگ تو برسوں میرے ملنے کی آرزو میں رہتے ہیں اور ملاقات نصیب نہیں ہوتی۔ میں خود تمہارے پاس آیا اور تم نے التفات بھی نہ کیا۔ فرمایا بڑے نادان ہیں جو خدا کی طلب کو چھوڑ کر آپ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا نہیں خدا ہی کے واسطے مجھے ڈھونڈتے ہیں مجھ سے دعا کراتے ہیں، حضرت ابراہیم بن ادہم نے فرمایا کہ اچھا آپ میرے لیے دعا کر دیجئے کہ میں نبی ہو جاؤں۔ فرمایا یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ نہیں ہو سکتا تو آپ مہربانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ میرا حرج ہوتا ہے، خیر یہ تو اُن کا ایک حال ہے۔ بہر حال ایک تو وُہ لوگ ہیں کہ حضرت خضر کو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں لیکن ملتے نہیں، ایک یہ تھے کہ خود ان کے پاس آئے اور انہوں نے پرواہ بھی نہ کی۔

وہ شخص بھی وظیفے پڑھتا تھا، دعا کراتا تھا لیکن حضرت خضر ملتے ہی نہ تھے۔ اتفاق سے ایک روز کہیں مل گئے۔ اس شخص نے پہچانا نہیں کیوں کہ ظاہری کوئی علامت[1] تو تھی نہیں۔ اور یہ جو عوام[2] میں مشہور ہے کہ اُن کے ہاتھ کے انگوٹھے میں ہڈی نہیں ہوتی لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔ بالکل واہیات، لغویات غرض حضرت خضرؑ نے خود ہی اُس شخص سے کہا کہ میں خضر ہوں، کہہ کیا کہتا ہے۔

---

[1] نشانی [2] عام لوگ

میری اس قدر کیوں تلاش تھی؟ احمق نے طلب بھی کیا تو کیا کہتا ہے کہ حضرت میرے لیے یہ دُعا کر دیجئے کہ دُنیا میں بے فکر ہو کر زندہ رہوں، حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ ارے یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں کسی کو بے فکری نصیب ہو، اُس نے دوبارہ عرض کیا کہ حضرت آپؑ دُعا تو کریں، حضرت خضرؑ نے پھر وہی کہا کہ ارے بھائی میں ایسی دُعا نہیں کر سکتا۔ ایسے کام کے لیے کیا دُعا کروں جو ہو ہی نہیں سکتا؛ اگر بیٹا کہے کہ میرے لیے یہ دُعا کرو کہ میں اپنے باپ کا بھی باپ ہو جاؤں تو بھلا یہ ہے نا لغو فرمائش کیوں ایسا ممکن ہی کہاں ہے؟ جب اُس نے زیادہ اصرار کیا تو حضرت خضرؑ نے اپنے اخلاق سے جواب دیا کہ خیر ایسی دُعا مانگنا تو بے ادبی کی بات ہے کیوں کہ ایسا ہونا عادت اللہ تعالےٰ کے خلاف ہے۔ ہاں تمام دِلّی میں جس کو اپنے نزدیک بے فکر سمجھو اُسے منتخب[1] کر لو۔ پھر میں یہ دُعا کر دوں گا کہ اے اللہ تعالےٰ یہ شخص بھی ایسا ہو جاوے جیسا فلانا۔ اس انتخاب کے لیے میں تمہیں چھ مہینے کی مُہلت دیتا ہوں۔ اس درمیان میں اطمینان سے تلاش کر رکھنا، میں چھ مہینے کے بعد پھر تم سے ملوں گا۔ اُس وقت اپنی رائے سے مطلع کرنا۔ وُہ شخص دِل میں بڑا خوش ہوا کہ کیا یہ مشکل بات ہے۔ دِلّی میں ہزاروں امرا ہیں۔ شاہی کارخانہ ہے بڑے بڑے دولتمند اور رئیس موجود ہیں۔ ایسا شخص مِل جانا مشکل ہی کیا ہے؛ بہت آسان ہے۔ چنانچہ اُس نے دِلّی میں گھومنا اور ایک ایک رئیس کو دیکھنا شروع کیا۔ جب کسی شخص کے بارہ میں رائے قائم ہوتی کہ اس جیسا ہونے کی دُعا کراؤں گا۔ اندرونی حالات تفتیش کرنے پر وُہ بھی کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا

---

[1] چُن لینا۔ پسند کرنا۔

نکلتا، یہاں تک کہ چھ مہینے کی میعاد ختم ہونے کو پہنچی۔ اب انہیں بڑا تردد[1] کہ حضرت خضرؑ کو کیا جواب دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے واقعی دنیا میں کسی کو آرام نہیں، چین جس کا نام ہے وہ کسی کو میسّر نہیں۔ آخیر میں ایک جوہری پر اُس کا گذر ہوا۔ دیکھا کہ لاکھوں کا کارخانہ ہے، بڑا ساز و سامان، سینکڑوں مکان اور دکانیں عالیشان فرش فروش، حشم خدم[2]، اولاد بھی کثرت سے، غرض عیش کا سامان موجود ہے اور خود گاؤ تکیہ لگائے نہایت اطمینان کے ساتھ ہٹا کٹا سُرخ سپید بیٹھا ہوا ہے۔ کچھ کام بھی نہیں کرنا پڑتا۔ کارندے[3] ایسے معتمد کہ سب کام انہیں کے ذریعہ سے نہایت خوبی اور انتظام کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ اس جوہری کو دیکھ کر یہ حضرت بڑے خوش ہوئے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تعالیٰ جیسا شخص میں چاہتا تھا ویسا آخر مل ہی گیا۔ بس اب کیا ہے اسی جیسا ہونے کی دُعا کرالوں گا۔ لیکن سوچا کہ بھائی احتیاط لازم پہلے اس سے مل تو لوں چنانچہ ملے اور سارا قصہ حضرت خضرؑ کی ملاقات کا اور اپنی دُعا کی درخواست کا سنایا۔ اور کہا کہ ساری دلی میں بس تم ایک شخص ایسے ملے ہو جن کو کوئی فکر نہیں اب میں حضرت خضرؑ سے بس یہی دُعا کراؤں گا کہ تم جیسا ہو جاؤں۔ یہ سُن کر اُس جوہری نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا کہ للّٰہ[4] مجھ جیسا ہونے کی ہرگز دُعا نہ کرانا۔ مجھ جیسا تو خُدا دشمن کو بھی نہ کرے جس مصیبت میں میں گرفتار ہوں وہ تو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو۔ یہ سُن کر اس کو بڑا تعجب ہوا۔ کہا میاں تم صاحبِ جائداد ہو، صاحبِ اولاد ہو، تندرست ہو، ہر طرح کا آرام، ساز و سامان، حشم خدم، نوکر چاکر دنیا بھر کی نعمتیں موجود ہیں اور

---

[1] فکر [2] نوکر چاکر۔ خدمت گار [3] کام کرنے والے [4] قابلِ اعتماد و اعتبار [5] خدا کے لئے

پھر کوئی کام بھی نہیں۔ اَب اَور کیا چاہیئے؟ پھر بھی کہتے ہو کہ ایسی مصیبت خُدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ بڑی ناشکری حق تعالےٰ کی ہے۔ جوہری نے کہا کہ خیر اَب تم سے کیا چھپاؤں بھائی میری تو دردناک حکایت ہے، ماجرا یہ ہے کہ جب میری شادی ہوئی تو قسمت سے بیوی مجھے نہایت حسین جمیل ملی۔ اُس سے مجھے بیحد محبت ہوگئی شادی ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ سخت بیمار ہوئی یہاں تک کہ مایوسی کی نوبت آگئی، میں رونے لگا۔ اُس نے کہا کہ جاؤ بھی یہ سب جیتے جی کی محبت ہے۔ مردوں کو کبھی باوفا نہیں دیکھا یہ لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہیں۔ میں مرجاؤنگی۔ تم دوسری کرلوگے، میں نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میری محبت تمہارے ساتھ بھلا ایسی ہے کہ تمہارے بعد میں دوسری بیوی کرلوں۔ یہ بھلا تم کیا خیال کرتی ہو؟ اس نے کہا اجی یہ سب باتیں ہیں کہیں آج تک کوئی اَور بھی رکا رہا ہے جو تم ہی رُکے رہوگے، چوں کہ مجھے اُس سے واقعی بے حد محبت تھی میں نے کہا کہ اچھا تمہیں یوں یقین نہیں آتا، لو میں ضرورت ہی کو حذف کئے دیتا ہوں اَور وہیں اُسترا لے کر میں نے اپنا اندام نہانی کاٹ کر الگ کردیا اَور کہا کہ اَب تو تمہیں یقین آویگا۔ کیوں کہ جڑ ہی نہ رہی جو ضرورت شادی کی ہو۔ اُس بھلے مانس نے بھی کمال کردیا۔ کہ اڈاہی اڑا دیا۔ جیسا کہ ایک افیونی نے کیا تھا۔ ایک افیونی صاحب پینک میں بیٹھے مزے لے رہے تھے ایک مکھی بار بار اُس کی ناک پر آبیٹھتی اَور اُس کی پینک کے مزہ میں خلل انداز ہوتی، وہ جھنجھلا کر اُسے اُڑاتا وہ پھر آبیٹھتی پھر اڑا دیتا وہ پھر

لے خوبصورت ۲ے وار کرنا ۳ے دخل دینے والا، فتور پیدا کرنے والا، رخنہ ڈالنے والا۔

آ بیٹھی۔ یعنی مکھی کچھ ہوتی ہی ہے ایسی ضدی۔ بس آپکو غصّہ آیا تو استرا لے کر اپنی ناک ہی اڑا دی۔ اور مکھی کو بڑے اطمینان سے مخاطب کر کے آپ فرماتے ہیں، کہ لے کسری اب بیٹھ کہاں بیٹھتی ہے۔ اب تیرا اڈا ہی نہیں رہا جہاں بیٹھے۔ اسی طرح ان حضرت نے بیوی کے سارے احتمالات[1] کی جڑ کو اڑا دیا۔ جوہری نے کہا کہ قصّہ مختصر وہ کمبخت پھر مری نہیں اچھی ہو گئی اور اب تک زندہ ہے۔ اِدھر میں بے کار[2] ہو ہی چکا تھا۔ اُدھر اُس کی جوانی۔ بس اُس نے میرے نوکروں سے ساز باز کر لیا۔ یہ جس قدر اولاد تم دیکھتے ہو، یہ سب میرے نوکروں کی عنایت ہے ایک مدت ہوئی کہ اس بے حیائی کو خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھلا کیا منہ لے کر روکوں اور کس برتے (حوصلہ) پر منع کروں۔ رات دن اسی غم میں گھٹتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ سُن کر وہ شخص انگلی منہ میں دبا کر حیرت زدہ[3] ہو گیا اور افسوس کرنے لگا، جوہری نے کہا کہ میں تو تم سے پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھ جیسے ہونے کی دُعا ہرگز نہ کرانا۔ لیکن تمہاری سمجھ میں ہی نہ آتا تھا۔ اب تو سارا حال معلوم ہو گیا۔ اور میں یہ بھی تم سے کہے دیتا ہوں، کہ دِلی تو دِلی دُنیا میں کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو بے فکر ہو، تم کس خبط میں مبتلا ہو؟ اس خیال کو چھوڑو اور جاؤ اپنی آخرت کی درستی کی دُعا کراؤ۔ میعاد مقررہ کے ختم ہونے کے بعد حضرت خضر علیہ السلام پھر اُس شخص کو ملے اور دریافت فرمایا کہ کہو بھائی کیا رائے ہے کونسا شخص تم نے منتخب کیا؟ اسے بڑی ندامت[4]

---

[1] احتمال بمعنی گمان کرنا [2] نکما

[3] حیران۔ [4] شرمندگی

ہوئی۔ عرض کیا کہ حضرت کیا عرض کروں، واقعی حضرت سچ فرماتے تھے، اَب مجھ کو اس کا عین الیقین[1] ہو گیا کہ دُنیا میں کوئی شخص چین سے نہیں۔ حضرت خضر ہنسے فرمایا کہ ہم نہ کہتے تھے لیکن تمہیں یقین ہی نہ آتا تھا۔ اَب تو دیکھ لیا۔ خیر اَب بولو کہ کیا چاہتے ہو؟ عرض کیا کہ حضرت بس آخرت کی درستی کی دُعا کر دیجیے۔ چنانچہ حضرت خضرؑ نے دُعا فرما دی اَور وُہ شخص ولی کامل بن گیا۔ سو حضرت واقعی دنیا میں کہیں چین نہیں ہے۔ تلاش کر کے دیکھو تب میرے کہنے کا یقین آوے یہ میرا دعوےٰ ویسے لفظاً تو مختصر سا ہے لیکن باعتبار تحقیق کے بہت بڑا ہے۔ بالکل سچی بات ہے۔ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ میں تم کو کیسے یقین کرا دوں کیوں کہ محض دلائلِ عقلیہ[2] اس کے لئے کافی نہیں بلکہ مشاہدہ[3] کے متعلق ہے۔ اگر میرے کہنے کا یقین نہیں تو آپ ایک سرے سے بڑے بڑے دنیاداروں کو دیکھنا شروع کر دیجیے کبھی کسی کو چین سے نہ پائیں گے۔

اگر اس میں بکھیڑا سمجھیں تو میں ایک بات مشابہ دلیل عقلی کے عرض کرتا ہوں، وُہ یہ کہ ہر شخص اپنے معاملات میں غور کرے کہ اوّل تو کسی کی ہر تمنا پوری ہوتی نہیں۔ کچھ نہ کچھ کسر رہ ہی جاتی ہے۔ لیکن خیر اگر کسی طرح سارا سامانِ راحت بہم پہنچا بھی لیا جاوے تب بھی چین جس کا نام ہے وُہ ہرگز کسی کے قبضہ میں نہیں اُس کو خدا نے اپنے ہی قبضہ میں رکھا ہے، واقعی بڑے بڑے سامان والوں کو بھی دنیا میں راحت میسّر نہیں۔ عادت اللہ تعالےٰ یوں ہی جاری ہے۔

ذکر کی برکت اَور اسکی حقیقت

اِدھر کی تو یہ حالت ہے، اَب دوسری حالت کو لیجیے، جو خدا

---

[1] بعد دیکھنے کے کسی چیز کی کیفیت اَور ماہیت کو بخوبی دریافت کر لینا۔ یقین کے تین درجات ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین [2] عقلی دلیلیں [3] آنکھوں سے دیکھنا۔

کی یاد میں مشغول ہیں کیا معنی کہ جو اس کے دھیان میں رہتے ہیں اور اُس کی پوری پوری اطاعت کرنے والے ہیں کیوں کہ بیٹھ کر اللہ اللہ کر لینا محض یہی اللہ تعالیٰ کی یاد نہیں۔ پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ یاد کسے کہتے ہیں؟ یاد میں یہ سب داخل ہیں جینا، دھیان رکھنا، اُس کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور اصلی یاد تو یہی ہے اس کو حکیم سمجھنا یعنی اس کی حکمت کا اعتقاد رکھنا، اس کو رحیم سمجھنا یعنی اس کی رحمت کا اعتقاد رکھنا۔ یہ سب خدا کی یاد میں داخل ہے جس نے اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی یاد کی، ۔ الخ آپ دیکھ لیجیے گا اور میں تو بعد دیکھنے ہی کے کہتا ہوں کہ وہاں ایسا سخت قرنطینہ[1] ہے کہ گو جسم پر اثر ہو لیکن اُن کے قلب تک پریشانی نہیں پہنچتی یہ میں نہیں کہتا کہ وہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوتے یا ان کو کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ یا ان کی کوئی غیبت نہیں کرتا، ان کو کوئی بُرا بھلا نہیں کہتا۔ یہ سب قصے ہوتے ہیں اور ان قصوں سے ہمیں غم بھی ہوتا ہے، رنج بھی ہوتا ہے تکلیف بھی پہنچتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن پریشانی اور الجھن نہیں ہوتی جو کہ اصل چیز ہے۔ تکلیف کی۔ اگر کوئی ظاہری تکلیف بھی انہیں پہنچتی ہے تو اس میں بھی ان کے قلب کو چین ہی ملتا ہے۔ وہ عین غم کی حالت میں بھی مسرور رہتے ہیں۔

ظاہری تکلیف اور قلبی راحت جمع ہونے کی وضاحت مثالوں سے

آپ کہتے ہوں گے کہ یہ شخص بھی عجیب الٹی تقریر کر رہا ہے۔ اجتماع

---

[1] اصلاً انگریزی لفظ ہے۔ (QUARATINE) یعنی وہ زمانہ جب مسافروں یا ایسے جہازوں کو جن پر کوئی وبائی امراض پھیل گئی ہو جبراً سب سے علیحدہ رکھا جائے تاکہ وبا نہ پھیلنے پائے۔ خوش

ضدین[1] ثابت کرنا چاہتا ہے جو کہ تمام عقلاء کے نزدیک محال ہے لیکن نہیں۔ میں انشاء اللہ تعالےٰ آپ ہی کے منہ سے کہلواؤں گا کہ یہ حالت ممکن ہے اور دنیا میں بکثرت واقع ہے۔ اچھا فرض کیجئے آپ کا کوئی محبوب ہے جس کی جدائی میں گھل گھل کر آپ کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ صرف ہڈیاں اور پسلیاں باقی رہ گئی ہیں اس حالت میں مدتوں کے بعد دفعتاً کہیں وہ آنکلا اور مشتاقانہ آپکو بغل میں لے کر زور سے دبایا۔ ادھر آپ، غایت درجہ کمزور اور ناتواں اُدھر وہ ہٹا کٹا۔ بھلا میں اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو اُس کے دبانے سے تکلیف نہیں ہے؟ تکلیف تو ایسی ہے کہ ہڈیاں اور پسلیاں ٹوٹی جاتی ہیں لیکن یہ تو ذرا سوچئے کہ اس تکلیف کا اثر قلب تک بھی کچھ ہے یا نہیں؟ اگر آپ واقعی عاشق ہیں تو واللہ تکلیف کیسی، قلب میں آپ یہ محسوس کریں گے کہ گویا رگ رگ میں ایک نئی جان پیدا ہوتی چلی جارہی ہے اور یوں کہیں گے ؎

"ایں کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب"

(یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں (نہیں معلوم) خواب کی حالتیں ہیں یا بیداری) ہائے یہ میری قسمت کہ جس کو ایک نظر دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا تھا وہ اس طرح آکر بغلگیر ہو۔ حتیٰ کہ وہ محبوب اگر یوں کہے کہ میرا دبانا اگر تم کو ناگوار ہو رہا ہے تو دیکھو یہ تمہارا رقیب موجود ہے۔ یہ بھی میرا بہت مشتاق ہے۔ اور میرے ساتھ ہمکنار ہونے کا بے حد آرزومند ہو تو تمہیں چھوڑ کر اُس کے ساتھ بھی معاملہ کرنے لگوں۔ اگر تمہیں کچھ تکلیف ہو رہی ہو تو کہہ دو۔ ایسی حالت میں عاشق کیا کہے گا۔ یہ کہیگا ؎

---

[1] مخالف چیزوں کو جمع کرنا۔

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت ٭ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(خدا کرے دشمن کو یہ بات نہ میسّر ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ ان پر خنجر آزمائی کرے اور ان کو کاٹے) بلکہ اگر سچ مچ قتل بھی کر دے تب بھی وُہ بزبانِ حال یہی کہیگا ؎

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے
کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

قتل سے بھی اُس کو کلفت نہ ہوگی۔ اگرچہ تکلیف سے کراہے بھی، تڑپے بھی۔ مگر وُہ تکلیف محض طبعی ہوگی، قلب کے اندر مطلق پریشانی نہ ہوگی، اسی طرح اہل اللہ کو اگر کوئی صدمہ پیش آتا ہے تو ان کی وہی حالت ہوتی ہے۔ جیسی میں نے ابھی بیان کی کہ عاشق کو معشوق کے دبوچنے سے تکلیف تو ہے لیکن اندر سے قلب نہایت راضی ہے، نہایت خوش ہے۔ اُس کے جسم کو ضرور تکلیف ہے۔ لیکن روح کو آرام ہے۔ اگر اُن کا بیٹا بھی مرجائے تو وُہ محزون[1] بھی ہوں گے، آنکھ سے آنسو بھی جاری ہو جائیں گے، لیکن قلب کے اندر پریشانی نہ ہوگی، کہ ہائے یہ کیا ہوگا۔ اب کیسی ہوگی۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ نہیں ہوتا کہ حسرت ہو اور ارمان ہو کہ ہائے یہ زندہ رہتا بلکہ اُن کا قلب نہایت مطمئن ہوتا ہے کہ یہ بالکل مناسب ہوا۔ اَلحمدُ للہِ تعالیٰ یہ جو کچھ ہوا بہت ٹھیک ہوا۔ بالکل حکمت ہے۔ سراسر رحمت ہے۔ بلکہ انہیں تفصیلاً حکمتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ ایمان اُن کا درجہ حال میں ہوتا ہے۔ درجہ اعتقاد میں تو

---

[1] رنجیدہ۔ غمگین

سب مسلمانوں کا ہے۔ اُن کو حال کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی راز ہے کہ انہیں خدا سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ بہ نسبت مخلوق کے۔ یہ نہیں ہے کہ انہیں مخلوق سے محبت نہیں ہوتی۔ مخلوق سے محبت بھی ہوتی ہے لیکن دَاللہ ثمّ دَاللہ مخلوق کی محبت، محبتِ حق کے مقابلہ میں بالکل مغلوب گویا معدوم ہوجاتی ہے۔ موازنہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ غالب غالب ہے اور مغلوب مغلوب ہے

چوں سُلطانِ عزّت عَلَم بر کشد | جہاں سر بہ جیبِ عدم در کشد!

(جب عزت کا بادشاہ یعنی خداوندِ عالم ظاہر ہوتا ہے، تو تمام دنیا معدوم ہوجاتی ہے۔)

گر آفتاب ست یک ذرہ نیست | وگر ہفت دریاست ایک قطرہ نیست

(قاعدہ ہے کہ جب آفتاب نکلا ہو تو ایک ذرہ کی کوئی حقیقت نہیں اور جب وقت سات سمندر موجود ہوں تو ایک قطرہ قابلِ التفات نہیں ہوتا (بوستاں)

جس وقت محبتِ حق کا غلبہ ہوتا ہے چاہے محبت مخلوق بھی ہو اور مخلوق کے کسی صدمہ سے کلفت بھی ہو لیکن اندر سے پریشانی نہیں ہوتی، وُہ کلفت پر بھی راضی ہے۔ اور خوش ہے کہ ہمارے لیے یہی مصلحت ہے، اسی میں حکمت ہے۔ یہی حال اُس کا دُعا کے ساتھ ہے کہ عین دُعا کے وقت بھی یہ تقاضا نہیں ہوتا کہ ایسا ضرور ہو ہی جاوے۔ اگر نہ ہو تو بھی تنگی نہیں ہوتی۔ وہ اس پر بھی دل سے راضی ہے۔ کہ خدا کی یہی رحمت ہے۔ غرض مذہب اُس کا یہ ہے ؎

چو نکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش | چوں کہ بکشاید برو برجستہ باش

(جس وقت تجھ کو میخ پر باندھ دے تو بندھا رہ۔ اور جس وقت کھول دیں تو جا اچھل کود یعنی خوش رہو خوشی کر) دفتر

لے گم۔ نیست کیا گیا ہے ہم وزن کرنا۔

اور اُس کا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

ناخوش او خوش بود در جانِ من دِل فدائے یار دِل رنجان من

(اُس کی ناخوشی بھی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ میرا دل دلکو رنج پہنچانیوالے معشوق پر قربان ہے۔ (مثنوی دفتر ۱)

خواہ غم ہو یا خوشی، راحت ہو یا تکلیف ہر حالت میں وُہ راضی اور خوش ہے اُس کا مذہب یہ ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دِل شد مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر تو مجھے زندہ کرے تو یہ تیری بخشش ہے اور اگر مار ڈالے تو میں تجھ پر قربان۔ میرا دل تیری محبت میں مبتلا ہے جو کچھ تو کرے تیری مہربانی ہے۔)

اَب اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ سب سے زیادہ مشکل امر اپنا مرنا ہے۔ یوں آدمی زبان سے تو کہتا ہے کہ مجھے مرنے کی کچھ پرواہ نہیں۔ لیکن امتحان کے وقت اُس کا دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے۔ تو سب سے بڑھ کر اپنی موت کا معاملہ ہے لیکن اللہ والوں کو اپنی موت کی بھی پرواہ نہیں اور ایک حیثیت سے اپنے مرنے سے زیادہ بھی اہم اپنی اولاد کا مرنا ہے کیوں کہ وہ محبوب ہوتی ہے اور محبوب کی جان اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے مگر ان کی حالت موتِ اولاد کے وقت بھی یہ ہوتی ہے کہ ہمارے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے جوان صاحبزادہ کا عین عید کے دن انتقال ہوا اُدھر جوان بیٹے کی نزع ہو رہی ہے۔ ادھر نماز کا وقت قریب ہے مولانا نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ لو بھائی خُدا کے سپرد۔ ہم تو اَب جاتے ہیں کیوں کہ ہمیں نماز پڑھنی ہے۔ انشاءاللہ

تعالےٰ اَب قیامت میں ملاقات ہوگی، یہ کہہ کر رخصت ہوگئے اور نماز کا اہتمام شروع کر دیا۔ آنکھ سے تو آنسو جاری تھے لیکن کوئی کلمہ بے صبری کا زبان سے نہیں نکلا۔ خوش تھے کہ اللہ تعالےٰ کی یہی مرضی ہے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے جوان صاحبزادہ کا انتقال ہوگیا۔ لوگ تعزیت[1] کے لیے آئے لیکن چُپ بیٹھے ہیں کہ کیا کہیں، اہل اللہ کا رُعب ہوتا ہے کسی کو ہمت نہ پڑتی کہ کچھ کہے اور کہتے بھی تو کیا کہتے؟ اگر کہے کہ رنج ہوا تو اس کے اظہار کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر کہے کہ صبر کیجیے تو وہ خود ہی کیے بیٹھے ہیں۔ آخر ہر جملہ خبریہ[2] کی کوئی نہ کوئی غایت تو ہونی چاہیے۔ بڑی دیر کے بعد آخر ایک نے ہمت کر کے کہا کہ حضرت بڑا رنج ہوا۔ فرمایا معلوم ہے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ بس پھر سارا مجمع چُپ۔ لوگ آتے تھے اور کچھ دیر بیٹھ بیٹھ کر چلے جاتے تھے، حضرت حاجی صاحبؒ کے انتقال کا صدمہ حضرت مولاناؒ کو اس درجہ ہوا تھا کہ دست لگ گئے تھے اور کھانا موقوف ہوگیا تھا۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی کچھ ذکر تو کر دے، میں بھی اُس موقعہ پر حاضر ہوا اَب میں وہاں پہنچکر متحیر[3] کہ یا اللہ تعالےٰ کیا کہوں؟ آخر چُپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ ایک مولانا ذوالفقار علی صاحب تھے۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کے والد بڑے عاشق مزاج اور حضرت حاجی صاحب کے والہ و شیدا، اُن کا یہ رنگ تھا کہ جب میں حضرت حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اوّل مرتبہ اُن سے ملنے گیا، تو میری صورت دیکھتے ہی بڑے جوش کے ساتھ کہا ؎

---

[1] ماتم پرسی [2] خبر دینے والا کلام [3] حیران۔

بنالہ بلبل اگر بامنت سرِ یاری ست ٭ کہ ما دو عاشقِ زاریم وکارِ ما زاری ست

(اے بلبل اگر تجھ کو میرے ساتھ دوستی کا خیال ہے تو رو۔ کیوں کہ ہم دونوں لاغر عاشق ہیں اور ہمارا کام رونا ہی ہے۔ (حضرت حافظ ؒ)

اور آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوگیا۔ خیر وہاں کچھ دل کی بھڑاس نکلی، حضرت مولانا گنگوہی ؒ پر اتنے بڑے بڑے صدمات پڑے لیکن کیا ممکن کہ کسی معمول میں ذرا فرق آجائے۔ چاشت، تہجد، اوابین کوئی معمول قضا تو کیا کبھی مؤخر بھی نہیں ہونے پایا۔ یہاں تک کہ جب کھانا بھی سامنے آیا تو اُسے بھی خدا کی نعمت سمجھ کر کھالیا۔ آنے والے کو یہ حالت دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ انہیں کچھ بھی رنج نہیں حالاں کہ رنج اس قدر ہوتا تھا کہ میں نے ایک عریضہ صاحبزادہ کی تعزیت کا لکھا تھا۔ اُس کے جواب میں مجھے صرف یہ لکھا کہ شدّتِ ضبط سے قلب و دماغ ماؤف ہوگیا ہے۔ مجھ کو اس پر بھی حیرت ہوئی تھی کہ یہ بھی کیسے ظاہر فرما دیا۔ بے حد عنایت تھی کہ اتنا لکھ دیا۔ ورنہ وہاں ضبط کی یہ شان تھی کہ کسی طرز سے غم کا پتہ بھی نہ چلتا تھا، نہ چہرہ سے، نہ زبان سے، نہ معاملات سے، وہی معمولات، وہی اذکار اشتغال، وہی تعلیم و تلقین۔ کیسا ہی حادثہ ہو کسی معمول میں ذرا فرق نہ پڑتا تھا۔ واللہ یہ تعلق مع اللہ تعالےٰ کی قوّت ہے۔ یہ وُہ قوّت ہوتی ہے کہ ؂

موحد چہ در پائے ریزی زرش ٭ چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

(موحد کے پیروں میں روپیہ کا خواہ ڈھیر لگا دیا جائے یا اس کے سر پر ہندوستان کی تلوار رکھی جاوے)

اُمید و ہراسش نباشد زکس ٭ بریں ست بنیادِ توحید و بس

لے آخر کیا گیا ۔ ملے دکھ پہنچا ہوا، آفت رسیدہ ۔ سلے جمع ذکر یعنی یاد کرنا۔

(اس کو کسی سے بھی امید و خوف نہ ہوگا. اصل توحید یہی ہے و بس (گلستاں باب)

اُن کا اعتقاد اور حال یہ ہوتا ہے کہ لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہ لَا حَکِیْمَ اِلَّا اللّٰہ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہ (کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، کوئی حکیم نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، کوئی مقصود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے) کسی چیز کا اثر اُن پر نہیں ہوتا یعنی ایسا اثر ہرگز نہیں ہوتا کہ عقل کو اور حواس کو پریشان کردے، باقی اثر کیوں نہ ہوتا، وُہ بے حس تھوڑا ہی ہوجاتے ہیں؛ بلکہ ان کی سی حس تو کسی میں بھی نہیں ہوتی. یوں ہونے کو تو قلب پر بھی ان کے اثر ہوتا ہے، مگر وُہ اثر پریشانی کی حد تک نہیں پہنچتا. بات یہ ہے کہ وہ سب شقوق (صورتوں) پر رضامند رہتے ہیں کہ یوں ہو جاوے تب بھی اچھا نہ ہو تب بھی اچھا. غرض کسی حال میں ناراضی نہیں، کیا عرض کروں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اس کیفیت کے بیان کرنے کو. بس جب خُدا نصیب کردے تب ہی معلوم ہو. ع

"قدر ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی"

(اس شراب محبت کی قدر خدا کی قسم نہیں پہچان سکتے جب تک کہ اسے خود ہی چکھ نہ لو)

قلب کو نہایت ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے. ذوقی امر ہے. بیان سے سمجھ میں نہیں آسکتا، تاہم ہم لوگوں کو اگر خود وُہ کیفیت حاصل نہیں ہے تو اس کے آثار کو دیکھ لیں آگ نظر نہ آوے تو اس کا دھواں تو نظر آتا ہے. دیکھئے سب سے بڑی چیز اپنی موت ہے. اس کے ساتھ ہی دیکھ لیجئے ان حضرات کا کیا معاملہ ہے؟ حضرت حافظ فرماتے ہیں اور کس ذوق و شوق سے فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم | راحت جاں طلبم وز پے جاناں بردم

(وہ کیا ہی خوشی کا دن ہے کہ میں اس اُجاڑ دنیا سے چلا جاؤں اور جان کی آرام و آسائش کو تلاش کروں اور معشوق کے پیچھے چلا جاؤں)

نذر کردم کہ گر ایں غم بسر آید روزے ❊ تا درِ میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(میں نے منت مانی ہے کہ اگر غم ایک روز آخر ہو جاوے گا۔ تو میں شراب خانے کے دروازے تک شاداں اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں گا۔ (دیوانِ حافظؒ)

حضرت عطّار کے لئے توجہ الی اللہ کا باعث

حضرت فریدالدین عطّاری کی دکان کیا کرتے تھے ایک دن اپنی دکان پر بیٹھے نسخے باندھ رہے تھے۔ ایک درویش کمبل پوش دُکان کے آگے کھڑے ہو کر انہیں تکنے لگے۔ دیر تک اسی حالت میں دیکھ کر حضرت عطّار نے فرمایا کہ بھائی جو کچھ لینا ہو لو کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ درویش نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری دکان میں شربت، خمیرے، معجونیں بہت سی چمکتی ہوئی چیزیں بھری پڑی ہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر مرتے وقت تمہاری روح کیسے نکلے گی جو اتنی چمکتی ہوئی چیزوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس وقت حضرت عطّار کو باطن کا کچھ چسکا تھا ہی نہیں، بیدھڑک کہہ بیٹھے کہ جیسے تمہاری نکلے گی ویسے ہماری بھی نکل جائے گی۔ درویش نے کہا کہ میاں ہمارا کیا ہے اور کمبل اوڑھ کر وہیں دُکان کے سامنے لیٹ گیا۔ اوّل تو حضرت عطّار یہ سمجھے کہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب دیر ہو گئی تو شبہ ہوا۔ پاس جا کر کمبل اٹھایا تو وُہ درویش واقعی مردہ تھا۔ بس ایک چوٹ دِل پر لگی اور وہیں ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ افاقہ ہوا تو دیکھا کہ دِل دُنیا سے بالکل سرد ہو چکا تھا۔ اُسی وقت دکان لٹا کر کسی پیر کی تلاش میں نکلے، پھر تو

وُہ طریق کے اندر دیکھئے کہ کتنے بڑے عارف ہوئے ہیں۔ کہ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہفت شہرِ عشق را عطارؔ گشت ۔۔۔ ما ہنوز اندر خمِ یک کوچہ ایم

(حضرت عطارؒ نے عشق کے ساتوں ملکوں کی سیر کر ڈالی اُدھر ہم ابھی تک ایک ہی گلی میں پڑے ہوئے ہیں۔ (مثنوی مولانا رومؒ)

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر سلاطین[1] کو اُس دولت کی خبر ہو جاوے جو ہمارے پاس ہے تو تلواریں لے کر ہم پر چڑھ آویں کہ لاؤ ہمیں بھی دو۔ واللہ یہی بات ہے۔ اس دولت کے سامنے سلطنت کی کوئی حقیقت نہیں۔ حضرتِ حافظؒ فرماتے ہیں اور مجھ سے سوائے اس کے کہ جن کا یہ حال تھا اُن کے اقوال[2] نقل کر دوں اور کیا ہو سکتا ہے؟ فرماتے ہیں ؎

بفراغِ دل زمانے نظرِ بماہ روئے ۔۔۔ بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ روز ہای و ہوئے

(دل کے اطمینان کے ساتھ تھوڑی دیر نظر ایک معشوق پر کرنا اس سے بہتر ہے کہ بادشاہت کی چھتری سر پر ہو اور دن و رات شور و غل مچا ہو (دیوان حافظؒ)

اسی کو خاقانیؒ کہتے ہیں ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی ۔۔۔ کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملکِ سلیمانی

(خاقانی کو تیس سال کے بعد اس بات کی تحقیق ہوئی کہ خدا کے ساتھ ایک گھڑی مشغول ہونا حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت سے بہتر ہے۔)

حقیقتِ حال معلوم کرنے کیلئے وقت نکال کر خود امتحان کر لو بالکل سچی بات

[1] جمع سلطان بمعنی بادشاہ [2] جمع قول

ہے میں کس طرح آپ کو یقین دلا دوں۔ ہاں ایک تدبیر بتلاتا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یوں سمجھ میں نہ آوے تو خود امتحان کر لیجئے۔ اور جن کی یہ حالت ہے کچھ دن اُن کے پاس جاکر دیکھئے میرے دعویٰ کا یقین آجاوے گا۔ بس اس کام کے لیے چھ مہینے خالی کرو۔ تین مہینے تو دُنیا کے متموّل لوگوں میں جاکر رہو اور تین مہینے اللہ والوں میں اور ان دونوں کی اندرونی حالت کی تفتیش کرو کہ کس کی زندگی کس طرح گذر رہی ہے واللہ آپ دوزخ اور جنت کا فرق پاویں گے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ حضرات اہل اللہ کبھی بیمار نہیں پڑتے یا اُن کا کبھی کوئی بیٹا نہیں مرتا یا اُن پر کوئی مصیبت نہیں آتی۔ اوّل تو واقعی اُن پر مصیبتیں کم آتی ہیں اور اگر ایسا موقع ہوتا بھی ہے تو وہ پریشان نہیں ہوتے، صورۃ نہیں بلکہ حقیقتاً پریشان نہیں ہوتے اور یوں تو آخر وہ بھی بشر ہیں۔ واقعات سے ان کو کوفت بھی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات اُن سے بعض معاصی بھی صادر ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ فرشتے ہو جاتے ہیں اور اُن کو گناہ کا میلان ہی نہیں ہوتا جیسا کہ بعض عوام کا اعتقاد ہے اور واقعی میلان کا ہونا ہی تو کمال ہے گناہوں سے بچنے میں فرشتوں کا کیا کمال ہے کیوں کہ انہی میلان ہی نہیں ہوتا۔ اس غرہ میں نہ رہنا حضرت اُن کو میلان ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اوروں کو بلکہ بعض دفعہ اوروں سے بھی زیادہ کیوں اُن کی حس نہایت لطیف ہو جاتی ہے۔ مگر وہاں اس کے ساتھ ہی چوں کہ اللہ تعالیٰ سے پورا تعلق ہے اس لیے تقاضائے نفس کو روکنے میں جو کلفت ہوتی ہے اُس کو برداشت کرتے ہیں۔ اور واللہ اُس کلفت میں بھی ایک لذت ہوتی ہے، سلطنت کی لذت میں بھی وہ مزہ نہیں جو اس لذت میں ہے اس کے سامنے سلطنت کی لذت کی کچھ حقیقت نہیں۔ مثلاً ابتلا ہو گیا کسی صورت

کے ساتھ بلا قصد و باوجود اہتمام احتراز ہوتا ہے ایسا کیونکہ ادھر تو انکا ادراک لطیف ہوتا ہے اور پھر کسی کی تحقیر قلب میں ہوتی نہیں، اسلئے انکو حسن سے ہوتا ہے بعید میلان ہوتا ہے۔ بس یہ حالت ہوتی ہے

درونِ سینۂ من زخم بے نشان زدہٗ ⁂ بحیرتم کہ عجب تیرِ بے کمان زدہٗ

(میرے سینے کے اندر تو نے ایک ایسا زخم لگایا جس کا نشان نہیں۔ ظاہر میں حیرت میں ہوں کہ تو نے عجیب بے کمان تیر لگایا ہے۔)

مگر ساتھ ہی چونکہ انہیں محبت کا تعلق حق تعالےٰ سے بھی ہوتا ہے طبعی بھی اور عقلی بھی۔ اس لئے وہ محبت اس محبت پر غالب ہوتی ہے۔ اور وہ اس کو غالب کرتے ہیں عمل سے، یعنی اُس کے مقتضا پر عمل نہ کرنا۔ کف عن المعصیت (گناہ سے رُکنا) نظر کو روکنا، خیال کو روکنا، تصورات کو روکنا گو اس میں سخت ضیق (تنگی) پیش آتی ہے۔ لیکن اُس کو برداشت کرتے ہیں اپنے محبوبِ حقیقی کے واسطے۔ پھر ایک وجدانی حلاوت (شیرینی) محسوس ہوتی ہے اس کی بدولت۔ قولِ سعدیؒ کے عموم میں وہ بھی داخل ہیں ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش ⁂ کہ گر ریش بینند و گر مرہمش

(اُس کے غم میں شوریدہ حال لوگوں کا کیا ہی اچھا وقت ہوتا ہے۔ خواہ زخم دیکھیں یعنی مصیبت پہنچے خواہ مرہم دیکھیں یعنی ان کو سامان راحت نصیب ہو۔)

دمادم شرابِ الم درکشند ⁂ وگر تلخ بینند دم درکشند

(وہ ہر وقت تکالیف کی شراب پیتے ہیں اور اگر وہ کڑوی ہو تو چپ رہتے ہیں شکایت نہیں کرتے (بوستاں باب ۳))

اس ضبط کا کیا اثر ہوتا ہے۔ بس تھوڑے ہی دنوں کے بعد لذت آنے لگتی ہے۔ کہ

یہ ساری کلفت تھی کس لئے اور وہ بزبانِ حال کہتے ہیں ؎

بہ جُرمِ عشق توام میکشند و غوغائے ست ٭ تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائے ست

(تیرے عشق کے جرم میں لوگ مجھے کھینچ رہے ہیں اور اک شور برپا ہے آپ بھی (اے معشوق) ذری چھت پر آ کر دیکھئے کہ اچھا تماشا ہے)

بس اس سے ان کو حظ (مزہ) ہوتا ہے۔ کہ محبوبِ حقیقی کے لئے یہ سب کلفتیں برداشت کر رہے ہیں ؎

خورند از برائے گُلے خارہا ٭ برند از برائے دِلے بارہا

(ایک دل کے واسطے بہت بوجھ لے جاتے ہیں۔ ایک پھول کے واسطے بہت کانٹے کھاتے ہیں)

اور وہ کبھی ہمت نہیں ہارتے ان کا عمل اس پر ہوتا ہے ؎

طلبگار باید صبور و حمول ٭ کہ نشنیدام کیمیا گر ملول

(طالب کو صابر اور متحمل ہونا چاہیئے میں نے نہیں سنا کہ کیمیا گر آزردہ ہو (بوستاں باب))

اور اُن کا یہ مذہب ہوتا ہے جیسا کہ کہتے ہیں عارف شیرازیؒ ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم ٭ کہ من نیز از خریدارانِ اویم

(ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ میرا معشوق یہ جان لے کہ میں اُس کے چاہنے والوں میں ہوں (حافظؒ)

چاہے کوئی لذت بھی نہ ہو۔ اگر لذت اور فرحت کے لیے امتثال[1] کیا تو کیا امتثال کیا؟

لذت اور فرحت کچھ بھی نہ ہو پھر بھی وہ یوں کہتے ہیں ؎

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم ٭ کہ من نیز از خریدارانِ اویم

بس فقط محبوبِ حقیقی کے راضی کرنے کے	محبوبِ حقیقی کو راضی کرنے کیلئے ہر قسم کی قربانی کرو

[1] حکم ماننا

لیے ان سب کلفتوں کو برداشت کرو، پھر خواہ وہ ان کلفتوں کو مٹا دیں نفس و شیطان پر غالب کر کے اور راحت فرما دیں۔ یا اسی طرح کشاکشی میں مبتلا رکھیں مگر اپنی طرف سے اپنے لیے کوئی حالت تجویز نہ کرے، نفس کے روکنے میں جو کلفتیں پیش آویں برداشت کرو۔ اور کچھ نہیں تو وہ تو دیکھیں گے کہ میرے راضی کرنے کے لیے کیسے کیسے تقاضوں پر غالب آرہا ہے۔ باقی میں بشارت دیتا ہوں کہ چند روز امتحان ہوگا۔ پھر ادھر سے مدد شروع ہوگی، اور انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو سب تقاضوں پر غالب کر دیا جاوے گا۔ کیوں صاحب پہلوانوں کو کشتی لڑتے نہیں دیکھا، پہلوان پورا زور صرف کرتا ہے تب مقابل کو پچھاڑتا ہے۔ بیکار ہو کر تو نہیں کھڑا ہوتا۔ اسی طرح تمہارا نفس و شیطان سے مقابلہ ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ دل کے اوپر کوئی بار نہ ہو اور غلبہ ہو جاوے پوری کوشش کرو، سرکار عالی ہمت دیکھ کر اگر تم میں قوت بھی نہ ہوگی غالب آنے کی تب بھی غالب کر دیں گے، جب دیکھیں گے کہ عاجز آگیا ہے خود مدد فرمائیں گے۔ تم اپنا سارا زور کر کے تو دیکھ لو۔ اگر کہو کہ صاحب اختیار میں نہیں تو یہ صریح قرآن و حدیث کی تکذیب[1] ہے، قرآن و حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے گناہ سے بچنے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔ اُس قدرت سے کام لو۔ جب تم عامل ہو گے تو تمہیں خود معلوم ہو جاوے گا۔ کہ واقعی ہمیں قدرت حاصل ہے، رہا شیطان، سو بخدائے[2] لایزال میں سینکڑوں قسمیں کھاتا ہوں کہ مومن پر شیطان کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ ہر مومن ہر شیطان پر غالب ہے۔ مثلاً نظر حرام کے وقت پر آنکھ اپنی نیچی رکھیں۔

---

[1] جھوٹا بتلانا [2] قسم اُس خدا کی جسے کبھی زوال نہیں۔

پھر شیطان کیا زبردستی اس پر کریگا؟ ہاں شاید کوئی شیطان الانس (شریر انسان) ایسا بھی کر دے تو آنکھیں بند کرلے اور اگر اس پر بھی نہ مانے اور زبردستی آنکھیں چیر کر کھولے تو نظر کی شعاع کو آگے نہ بڑھنے دے یہ تو اس جابر کے اختیار میں نہیں غرض کوئی بات نہیں جو انسان نہیں کرسکتا۔ ہاں تکلیف ضرور ہوتی ہے سو اس کو برداشت کرنا چاہیئے۔ خدا کے ساتھ تو نسبت اور پھر تکلیف سے بچنا چاہو حضرت بلا تکلیف اٹھائے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ ؎

نازپرورد تنعم نہ برد راہ بدوست :: عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

(عیش وعشرت میں پرورش پائے ہوئے دوست تک راہ نہیں لیجاتا یعنی راہ قطع کرکے دوست تک نہیں پہنچ سکتا۔ عاشقی تو مصیبت جھیلنے والے رندوں ہی کا شیوہ ہے (دیوان حافظؒ)

اپنی طرف سے	بندگی تو رائے ختم کرنے کا نام ہے خدائی کے طالب نہ بنو

تو ساری عمر تکلیف میں رہنے کے لیے آمادہ ہوجانا چاہیئے پھر مالک چاہے دو دِن بھی تکلیف میں نہ رکھے۔ تم کو تجویز کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟ یہ خدائی ہے یا بندگی ہے؟ جناب یہ بندگی ہے کوئی کھیل نہیں ہے۔ بس اپنا مذہب یہ رکھنا چاہیئے ؎

چونکہ بر میخت بہ بند دبستہ باش :: چوں بکشاید بر و برجستہ باش

سوچو تو اگر خدانا کردہ ساری عمر کے لیے کوئی بیماری لگ جاوے۔ مثلاً اندھا ہوجانا ہے۔ تو کیا مر رہو گے۔ آخر برداشت کر دگے اور عمر اسی طرح تیر کر دو گے۔ اسی طرح اگر حق تعالےٰ کسی باطنی مصیبت میں مبتلا کر دے تو صبر کرو۔ انشاءاللہ تعالےٰ غالب آؤ گے، اور اگر کلفت برابر بھی رہے گی تو کیا ہے۔ اگر

اسی میں مرگئے تو شہید اکبر مروگے، حدیث شریف میں ہے: مَنْ عَشِقَ فَكَتَمَ وَعَفَّ فَمَاتَ فَهُوَ شَهِيدٌ[1]۔ اگر کوئی عشق میں مبتلا ہو جاوے اور عفت اختیار کرے اور دوسرے کو رسوا نہ کرے بلکہ اپنے عشق کو چھپائے یہانتک کہ وہ اسی حالت میں مرجائے تو وہ شہید مرتا ہے۔ تصور بھی خلاف شریعت نہ کرے چاہے اس گھٹن اور تکلیف سے مرہی جاوے، لیکن خلاف شریعت کوئی کام نہ کرے۔ سنو تو آخر کسی دن تو مروگے، یہ کیوں چاہتے ہو کہ نیت باندھ کر مریں یعنی مریں بھی جیسے ہم چاہیں۔ جب پیدا نہیں ہوئے اپنی مرضی کے موافق تو موت اپنی مرضی مطابق کیوں چاہتے ہو؟ (کاتب وعظ عرض کرتا ہے کہ بیان نہایت جوش خروش کے ساتھ ہو رہا تھا اور مجمع میں ایک سکتہ کا عالم تھا۔ بالخصوص ایک صاحب پر جو عشق مجازی میں مبتلا تھے بیحد اثر تھا اور اُن پر نہایت شدت کے ساتھ گریہ طاری تھا۔ اُن کو ایک دوسرے صاحب بار بار دیکھتے تھے۔ حضرت نے اُن کو جھڑکا کہ یہ کیا لغو حرکت ہے تم اپنے کام میں لگو) تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ جیسے ہم چاہیں ویسے زندہ رہیں اور جیسے ہم چاہیں ویسے مریں، تمہیں تجویز کرنے کا حق کیا ہے؟ خدا تعالےٰ جیسے چاہیں گے رکھیں گے آرام میں یا تکلیف میں اور جس حالت میں چاہیں گے ماریں گے لیکن میں بشارت دیتا ہوں کہ اگر تم اپنی طرف سے عمر بھر تکلیف میں رہنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ گے، تو اس تفویض[2] کی برکت سے انشاء اللہ تعالےٰ بہت جلد راحت نصیب کر دیں گے اور ایسی راحت نصیب کریں گے جس کو تم بھی راحت سمجھو گے، ہمت کر کے تو دیکھو ع

"چند روزے جہد کن باقی بخند[3]"

[1] جامع صغیر ص ۳۸۳ ج ۲ [2] سپردگی [3] کچھ دن محنت کر دے پھر ہنسو۔

چند روز کی مصیبت ہے پھر ہنسنا ہے کھیلنا ہے وعدہ ہے۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (جو شخص کوئی نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو دنیا میں پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے (القرآن پارہ ۱۴) نافرمانی میں خاص اسی وقت تو لطف آتا ہے۔ لیکن پھر بعد کو بس پوری مصیبت کا سامنا ہے۔ مثلاً دن کو ایک حسین عورت سامنے سے گذری نفس نے دیکھنے کا بہت تقاضا کیا لیکن فوراً آنکھیں بند کرلیں، نظر کے روکنے میں اس وقت تو بہت تکلیف ہوگی۔ جب الگ ہوگئے تو واللہ دیکھو گے کہ دل میں ایک بہار ہوگی اور سارا دن، ساری رات آرام میں گزریگا، اور اگر نظر بھر کر دیکھ لیا اور پھر چار دن نظر نہ آئے تو دوزخی سی زندگی گذرے گی۔ کہتے ہیں کہ صاحب نظر کے روکنے کی کلفت نہیں اٹھتی۔ میں کہتا ہوں کہ ایک منٹ کی تو کلفت نہ اٹھی اور چار دن کی کلفت اٹھالو گے۔ یہ تو وہی ہوا کہ گنا نہ دے بھیلی دے۔

ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ

بعض کو بعض معاصی کی نسبت یہ غلطی ہوگئی ہے کہ ایک مرتبہ اچھی طرح دل کھول کر گناہ کرلینے سے ارمان نکل جاوے گا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اس سے قلب کے اندر جڑ اور زیادہ جمتی ہے گو اس وقت تسکین ہوجاوے۔ تمباکو کی سی لت ہے کہ جتنا پیوگے اتنی ہی اور لت بڑھے گی اور اگر ہر بار خواہش کو روک لوگے تو کچھ دن بعد بالکل بجھ جاوے گی۔ یوں ہی نفس کو مارو انشاء اللہ تعالیٰ مادۂ فاسد جڑ پیڑ سے اکھڑ جاوے گا۔ خلاصہ عذر کا یہ ہوتا ہے کہ صاحب ہمت

نہیں ہوتی۔ دین کے واسطے تو ہمت نہیں ہوتی اور دنیا کے واسطے بڑی ہمتیں کرتے ہو۔ حضرت اگر کوئی حاکم آپ پر ایک شخص کو مسلط کر دے کہ جس وقت یہ نامحرم پر نظر کرے فوراً اس کی آنکھوں میں تکلے دے دینا تو سچ کہیے کیا پھر بھی نظر کو نہ روک سکو گے؟ دیکھیں تو پھر نظر کیسے نہیں رکتی۔ پھر افسوس ہے اللہ میاں کے تکلوں کا ڈر نہیں۔ بات یہ ہے کہ تکلیف اٹھانا گوارا نہیں ورنہ سب کچھ ممکن ہے خدا کے طالب نہیں راحت کے طالب ہیں مگر راحت حقیقی بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے ددو بے دام نیست ٭ جز بہ خلوت گاہِ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ جال اور درندوں سے خالی نہیں ہے سوا خدا کی خلوت گاہ کے اور کہیں آرام نہیں (مثنوی دفتر ۲) جدھر جاؤ مصیبت ہے

گر گریزی بر اُمید راحتے ٭ زاں طرف ہم پیشت آید آفتے

(اگر تم کسی راحت کی امید پر کسی مصیبت سے بھاگو تو اُس کی طرف سے بھی تمہارے آگے ایک نئی آفت اور مصیبت آوے گی (مثنوی دفتر ۲)

بس بجز خلوت گاہِ حق کے کہیں آرام نہیں ہے

ہیچ کنجے بے ددو بے دام نیست ٭ جز بہ خلوت گاہِ حق آرام نیست

اطمینانِ قلب کہیں میسّر نہیں ہو سکتا۔ اگر اطمینان قلب چاہتے ہو تو قلب کے اندر اللہ تعالیٰ کی یاد بسا لو۔

جس درجہ کا ذکر ہوگا اسی درجہ کا اطمینان: یہ میں نہیں کہتا کہ ذکر شروع

کرتے ہی اطمینان کا درجہ حاصل ہو جاویگا، بلکہ جب ذکر سبب ہے اطمینان کا تو جتنا ذکر بڑھیگا اتنا ہی اطمینان کا درجہ بڑھیگا۔ جب ذکر کامل ہو جاوے گا تو اطمینان بھی کامل ہو جائے گا۔ پھر اس دولت سے مشرف ہو گے مرتے وقت اور صاحب سچ یہ ہے کہ ہزار زندگیاں قربان ایسے مرنے پر کہ ارشاد ہوگا "یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ" (اور جو اللہ تعالےٰ کے فرمانبردار تھے ان کو ارشاد ہوگا کہ اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوارِ رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ پھر (ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا۔ (کہ یہ بھی نعمتِ روحانی ہے) اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ پ۳۰) اے جان اطمینان والی جس کو ذکر اللہ تعالےٰ میں چین تھا آجا اپنے رب کی طرف اور لفظ "اِرْجِعِیْ" میں ایک لطیفہ ہے یعنی اس میں اشارہ ہے کہ تم خدا ہی کے پاس تھے یہاں تو تم آکر اجنبیوں میں مبتلا ہو گئے تو تمہارا مرنا اصل کی طرف واپس جانا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش ❊ باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

(ہر شخص کا قاعدہ ہے کہ جب اپنی اصل سے جُدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصال کا جویاں ہوتا ہے (مثنوی دفتر ۱)

حضرت عارف جامیؒ کہتے ہیں ؎

ولا تا کے دریں کارخ مجازی ❊ کنی مانندِ طفلاں خاکبازی

چرا زاں آشیاں بیگانہ گشتی ❊ چو دوناں چُغدِ ایں ویرانہ گشتی

(اے دل تو کب تک اس مجازی یعنی عارضی محل میں لڑکوں کی طرح مٹی سے کھیلتا رہے گا۔ اور اس آشیاں یعنی آخرت سے تو کیوں اجنبی بن گیا اور نااہلوں کی طرح سے اس دنیا کے ویرانہ کا تو بن کر رہ گیا)

اب اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ پھر تم کو دنیا و آخرت کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے اور اس کو اس مثال سے سمجھو کہ تم کبھی جلال آباد سے مظفر نگر جاتے ہو تو جو چیز وہاں اچھی ہوتی ہے اس کو یہاں لاکر برتتے ہو پھر یہاں دنیا میں آخرت سے کیوں اجنبی ہو گئے۔ چاہیے یہ کہ دنیا بھی ملے تو آخرت کے واسطے لے جاؤ۔ قارون کو خطاب ہے۔ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ۔

(اور تجھ کو اللہ تعالیٰ نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کر اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش مت کر اور جس طرح خدا تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی احسان کیا کر اور دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو) باہر جلال آباد کے تلاشِ معاش میں جاتے ہو وہاں سے کما کر لاتے ہو اور یہاں کھاتے ہو۔ اسی طرح آخرت کے لئے یہاں سے کمائی کر کے اور بٹور بٹار کر وہاں لے جاؤ۔ یہاں سے ذخیرۂ آخرت جمع کر کے اپنے رب کے پاس پھر لوٹ جاؤ۔ دنیا میں آخرت کی فکر سے غافل مت رہو۔ کیوں کہ جہاں سے آئے تھے وہیں لوٹ کر جانا ہے۔ اور یہاں سے لوٹ کر وہاں جاؤ تو کس طرح جاؤ؟ جس طرح آگے اس نفس کے خطاب میں فرماتے ہیں۔ "رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً" تم اللہ تعالیٰ سے راضی اللہ تعالیٰ تم سے راضی۔ دیکھئے بہت لوگ لاکھوں روپیہ حکام

لے روزی۔ کھانے پینے کا سامان۔

کے خوشنود (راضی) کرنے کو خرچ کرتے ہیں۔ کیا ہر ہر حاکم کی تو خوشنودی مطلوب ہو اور حاکمِ حقیقی ہی کی خوشنودی مطلوب نہ ہو۔

دخولِ جنّت کا ذریعہ اللہ کے بندوں سے لگے لپٹے رہنا ہے

پھر ارشاد ہوتا ہے

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ "میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اے نفسِ مطمئنّہ اور داخل ہو جا میری جنّت میں۔ حق تعالےٰ نے یہاں دو ثمرے ذکر فرمائے ہیں۔ خاص بندوں میں شامل ہونا، اور جنّت میں داخل ہونا۔ ذرا غور کیجئے خاص بندوں میں داخل ہونے کو پہلے فرمایا ہے پھر جنّت میں داخل ہونا مذکور ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز خاص بندوں میں شامل ہونا ہے جس کی بدولت جنّت ملے گی۔ اس جگہ اشارۃً یہ بات بھی ظاہر فرما دی کہ اگر ہمارے خاص بندوں کے ساتھ لگے لپٹے رہو گے تو جنّت میں داخل ہونا نصیب ہو جاوے گا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق ❊ گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(خدا اور اس کے خاص لوگوں کی مہربانی کے بغیر اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق سیاہ رہیگا)

صرف کتابیں دیکھنا اصلاح کیلئے کافی نہیں اصلاح کیلئے کسی کامل شیخ کی محبّت و اتباع ضروری ہے

بہت لوگ اس غرّہ (دھوکہ) میں ہیں۔ کہ کتابیں دیکھ کر ہم کر سکتے ہیں اپنی اصلاح، کیوں کہ کتابوں میں سب طریقے مذکور ہیں۔ یہ بالکل غلط خیال ہے واقفانِ فن اور اہلِ تجربہ سب اس پر متفق ہیں کہ عادۃً ایسا ہرگز

نہیں ہوسکتا بدوں ماہرِ فن شیخ کامل کے آدمی اپنی اصلاح نہیں کرسکتا، کتابیں دیکھ کر تربیتِ باطن تو بڑی چیز ہے۔ دُنیا ہی میں نظریں دیکھ لو بلا اُستاد کے کوئی فن نہیں آسکتا۔ کتاب خوانِ نعمت موجود ہے اس میں سب کھانوں کی ترکیبیں مفصل درج ہیں۔ یعنی پلاؤ کس طرح پکایا جاتا ہے۔ شامی کباب کس طرح بنتا ہے۔ بھلا کوئی پلاؤ اور شامی کباب پکا تو لے بے استاد، محض کتاب میں ترکیب دیکھ کر۔ اسی طرح تربیتِ باطن ہو نہیں سکتی بدوں شیخ کے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہِ را تنہا مرو ٭ از سرِ خود اندریں صحرا مرو

(راستے کے لیے رفیق کی ضرورت ہے تنہا اس جنگل کو نہ قطع کرنا چاہیئے (مثنوی دفتر ۲)

کوئی رفیق ڈھونڈو، بدوں رہبر کے اس صحرا میں قدم مت رکھو۔ آگے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادریں راہ را برید ٭ ہم بعونِ ہمتِ مرداں رسید

(اگر شاذ و نادر کسی نے اس کو تنہا قطع بھی کرلیا ہے تو یہ محض ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے ورنہ دراصل کسی نہ کسی مردِ خدا کی توجہ اس کے ساتھ بھی متعلق رہی ہے۔ (مثنوی دفتر ۱)

یعنی اگر شاذ و نادر کسی نے اس راہ کو تنہا قطع بھی کرلیا ہے تو یہ محض ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے ورنہ دراصل کسی نہ کسی مردِ خدا کی توجہ اُس کے ساتھ بھی متعلق رہی ہے، گو خود اُس کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ کہ کدھر سے یہ فیض آرہا ہے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ مُرید ہوجاؤ۔ یہ تو پکھنڈ ہے۔ بیعت برکت کی چیز ضرور ہے اس سے انکار نہیں، اصل چیز محبت اور اتباع ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اگر عمر بھر بھی مُرید نہ ہو تو مطلق حاجت نہیں۔ بڑا ناس کیا ہے پیری مریدی کا بہت سے پیروں نے۔ لوگوں کو یہ سکھلایا ہے کہ بغیر مُرید ہوئے کچھ نفع ہی نہیں ہوتا حالانکہ

یہ بالکل غلط ہے اُن سے اگر کوئی مُرید ہو گیا پھر چاہے اس کی کیسی ہی بُری حالت ہو تب بھی اُس سے راضی اور اگر مُرید نہ ہوا تو بعضے اُس کو تعلیم و تلقین ہی نہیں کرتے جب تک مُرید نہ ہو یعنی وہ لوگ عام طور پر اذکار و اشغال بتلانے سے بخل کرتے ہیں جیسے کوئی طبیب ہو جس کو کچھ آتا جاتا نہ ہو وہ اپنے مطب[1] کے نسخوں کی بڑی حفاظت کرتا ہے کہ اگر مطب کے نسخے ہی بانٹ دیے تو پھر اس کے پاس کیا رہ جاویگا۔ خلاصہ یہ کہ مرید چاہے ہو یا نہیں، لیکن کسی محقق[2] سے تعلق پیدا کرو۔ اگر منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتے ہو تو پہلے راستہ ڈھونڈو۔ اوّل تو بعضے تعلق ہی نہیں پیدا کرتے اور بعضے تعلق بھی پیدا کرتے ہیں تو یہ کہ مُرید ہو گئے بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔ رہا ذکر و شغل وغیرہ اور اصلاح نفس اس کو پیر کے ذمہ سمجھتے ہیں گویا جس کو اُستاد بنایا اُسی کے ذمے سبق یاد کرنا ہو گا۔ ارے اگر اُستاد نے سبق یاد بھی کر لیا تو اُس کے یاد کر لینے سے تجھے تو یاد نہیں ہو گیا۔ یہ سمجھ رکھا ہے کہ مرید ہوتے ہی بس سب ٹاٹ پلان پیر کے ذمہ ہو گیا۔

مفید مطلب اور دلچسپ حکایت

بقول کسی جاہل دیہاتی کے پیر کے۔ ایک گاؤں کا پیر اپنے دیہاتی مُرید کے پاس پہنچا پیر صاحب کسی بیماری سے اٹھے تھے۔ اس لئے دُبلے بہت ہو رہے تھے دیہاتی نے دیکھ کر کہا کہ اے پیر توں (یعنی تو) دُبلا بہت ہو رہا ہے۔ پیر صاحب کو موقع مل گیا۔ کہا ارے بھائی دُبلا نہ ہوں تو اور کیا ہوں؟ روزے تم نہیں رکھتے وہ مجھے رکھنے پڑتے ہیں تمہارے بدلے، نماز تم نہیں پڑھتے وہ مجھے پڑھنی پڑتی

---

[1] وہ مقام جہاں طبیب بیٹھ کر بیماروں کا علاج کرے [2] تحقیق کرنے والا۔

ہے ، تمہاری طرف سے ، روزہ نماز نے تمہارے مجھے دُبلا کر رکھا ہے اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مجھے تمہارے عوض پلصراط پر چلنا پڑتا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے ۔ دیہاتی نے یہ سُن کر کہا کہ دَدھ وَدھ تجھے بڑی محنت ہمارے لئے کرنی پڑی ہے جا میں نے تجھے اپنا موجی کا کھیت دے دیا۔ پیر صاحب نے سوچا کہ یہ دیہات کے لوگ ہیں ان کا کیا اعتبار اب تو دے رہے ہیں پھر کہیں نیت بدل جائے ، اس لیے ابھی چل کر کھیت پر قبضہ کر لینا چاہیئے ، کہا کہ تم چل کر قبضہ کرا دو ، دیہاتی ساتھ ہو لیا اور پیر کو آگے کیا کہ چل میں تجھے وُہ کھیت دکھا دوں ۔ راستہ میں کھیتوں کی ڈولیں پڑیں ۔ چلتے چلتے پیر صاحب کا پیر جو پھسلا تو مینڈ کے نیچے جا رہے ۔ دیہاتی نے اوپر سے ایک لات اور رسید کی کہ سہرے تُو تو کہتا تھا کہ میں تمہاری عوض پلصراط پر چلتا ہوں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے ۔ چار انگل کی مینڈ پر تو تجھ سے چلا ہی نہ گیا ، پلصراط پر تو کیا چلتا ہوگا ۔ تو جھوٹا ہے ۔ جا ہم کھیت نہیں دیتے ۔ یہ کہہ کر رستہ ہی سے لوٹ آیا ۔ لات ماری الگ اور کھیت چھین لیا الگ ۔ اب جھوٹے پیروں نے صدیں گزر گئیں یہ ذہن نشین کرا رکھا ہے کہ پیر سارا بوجھ اٹھا لیتا ہے آخرت کا بوجھ بھی اُس کے سر پر اور دُنیا کا بوجھ بھی اُسی کے سر پر ۔ تو وُہ پیر کاہے کو ہوا ، پلّہ دار ہوا ۔ آخرت کا اور دنیا کی مثال بھنگی کی سی ہوئی کہ ہگو تو تم اور اٹھا دے وُہ ۔ مقدمہ بھی اسی کے ذریعے فتح ہو جا دے گا ۔ بیٹا بھی اسی کے ذریعہ ہو جا وے گا ۔ اجی وہ تو دنیا کا اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھاتے تمہارا تو کیا اٹھا دیں گے ، یہاں پر میں ایک مثال دیتا ہوں جو دوستوں کے کام آ دے گی۔

پیر اور مرید کے تعلق کی مثال

پیر اور مرید کا تعلق بالکل طبیب اور مریض کا سا ہے۔ مریض اگر طبیب سے کہہ دے کہ میں آج سے تمہارا مریض ہوں اور طبیب اُس سے اقرار کرلے کہ میں آج سے تیرا طبیب ہوں تو کیا محض اس عہد پیمان ہی سے شفا ہو جاوے گی، ہرگز نہیں۔ علاج تو کرانا ہی ہوگا۔ طریقہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جاکر طبیب سے خود مرض کو بیان کرتے ہیں، خود کہتے ہیں کہ یہ روگ ہے مجھے۔ یہ نہیں کرتے کہ گئے اور چپ بیٹھ گئے۔ اِسی طرح روز چار گھنٹے بیٹھ آئے نہ کچھ حال کہنا نہ کچھ نسخہ لکھوانا، نہیں بلکہ وہاں تو بار بار ایک حال کو بالتفصیل طبیب کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ وُہ کہتا بھی ہے کہ میں سمجھ گیا لیکن اصرار ہوتا ہے کہ ذرا اور سُن لیجیے۔ تسلی نہیں ہوتی شاید کوئی بات بیان کرنے سے رہ گئی ہو، لیکن پیر کمبخت کی یہ کمبختی کہ اُس سے حال اپنے امراض باطنی کا نہ کہا جائے بلکہ تمہارے اندر جو امراض ہیں اُن کو وُہ خود ہی بیان کردے اور خود ہی بدوں تمہاری طلب کے ان کا علاج کر دے تو گویا وُہ فوٹو گراف ہوا کہ تمہارے دِل کے اندر جو کچھ ہے وُہ خود بخود اس کے دل میں آجاوے۔

پیر کیلئے صاحب کشف ہونا ضروری نہیں نہ ہی کشف کمال ہے

اور اگر کشف کا بھروسہ ہو تو خوب سمجھ لیجیے کہ اوّل تو کشف اختیاری نہیں کہ جس وقت چاہا دوسرے کے دِل کا حال معلوم کرلیا۔ دوسرے اگر کشف ہو بھی گیا تو بدوں تمہارے طلب کئے ہوئے اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے۔ کہ زبردستی سر ہوتا پھرے، وُہ محتاج نہیں یہ خود محتاج ہے۔ مانگے گا

تو دیں گے اور اگر مانگتے بھی عار آتی ہے تو ان کی جوتی سے، پھر یہ بھی ہے، کہ کشف کی اُن کے نزدیک کوئی قدر نہیں، وہ نہ اُس کو کمال سمجھتے ہیں، نہ اس پر اعتماد رکھتے ہیں "کشف را بر کفش می زنند" (کشف کو جوتے پر مارتے ہیں) اور واقعی کشف کوئی چیز قابلِ قدر کے ہے بھی نہیں، کافروں تک کو کشف ہوتا ہے۔ جوگیوں کو کشف ہوتا ہے، شیطانوں کو کشف ہوتا ہے بلکہ جانوروں تک کو کشف ہوتا ہے۔ یہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ بہائم کو قبر کا عذاب منکشف ہوتا ہے۔ لو صاحب یہ حقیقت ہے کشف کی جس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں پیروں کا۔

غرض یہ ہے کہ طبیب سے جس طرح رتی رتی اپنا حال ظاہر کر دیتے ہو اور اپنے روگ چھپانا نہیں چاہتے اسی طرح پیر سے بھی اپنا کچا چٹھا بیان کر دو، یہاں تو یہ حال ہے کہ خود تو کیا بیان کرتے، اگر کوئی پیر خود ہی کسی بات پر ٹوکتا ہے تو باتیں بنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ کسی غلطی پر متنبہ کیا تو وہیں اسکی توجیہ کرنی شروع کر دی۔ جب تم کہتے ہو کہ ہمارے اندر عیب نہیں تو دوسرا کس چیز کی اصلاح کرے؟ جب تم بیمار ہی نہ ہو تو طبیب علاج کیا کرے ع

"اے[1] خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست"

مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ٭ ہر کجا فقرے نوا آنجا رود

---

[1] عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست ..... مقصود تنبیہ ہے ان سالکوں کو جو حرمان کا شکوہ کیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کوتاہی طالب کی طرف سے ہے مطلوب سے دریغ نہیں پس اپنی اصلاح چاہیے۔ (دیوان حافظ رح)

ہر کجا مشکل جواب آنجا رود ❊ ہر کجا پستی است آب آنجا رود

جب تم نے مرض ہی نہ بیان کیا تو کوئی علاج کیا کرے۔ اگر پیر کسی عیب پر متنبہ کرے تو اُس کی تقریر کو خوب غور سے سُنے اور سوچے سمجھے۔ یہ نہیں کہ توجیہ کرنی شروع کر دے بلکہ اگر وہ عیب اس میں نہ بھی ہو، تب بھی اس کا کیا بگڑ گیا۔ چلو ایک کام کی بات ہی معلوم ہو گئی۔ اگر خارش نہیں ہے تب بھی نسخہ تو پوچھ لو کسی وقت کام آ دیگا۔ پھر تمہارا سمجھنا بھی قابلِ اعتبار نہیں کہ ہم میں عیب نہیں۔ بعض اوقات اپنا مرض خود اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ طبیب نے نبض اور قارورہ دیکھ کر اپنی بصیرتِ فن سے یہ تشخیص کیا، کہ خارشت کا مادہ یعنی سودا بدن میں پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا جلد انسداد کرنا چاہیئے ورنہ عنقریب خارشت ہونے والی ہے۔ یہ سُن کر مریض کو چاہیئے کہ فوراً علاج کی فکر شروع کر دے یہ نہیں کہ اس کی تردید کرنی شروع کر دے کہ نہیں صاحب میں بالکل تندرست ہٹا کٹا ہوں، مجھے کیوں خارشت ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ پیر کے سامنے اپنا اصلی مرض بھی بیان کر دو اور خود بیان کر دو۔ اس کے منتظر نہ رہو کہ وُہ خود پوچھے یا کشف سے معلوم کر لے۔ جب طبیب سے حال کہہ دیا جاتا ہے۔ تو وہ مرض تشخیص کر کے نسخہ لکھتا ہے۔ اُس کے استعمال کے بعد پھر اطلاع حالات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اب یہ حال ہے۔ پھر اُس کے مناسب نسخہ میں تغیر و تبدل کیا جاتا ہے۔ یہی طریقہ شیخ سے رجوع کرنے کا ہے کہ اوّل مرض بیان کر دو، پھر وہ جو کچھ تجویز کر دے ذکر، شغل، مجاہدہ یا اور کچھ اُس پر عمل کر کے اطلاع ان باتوں کی دو، کہ یہ مرض تشخیص کیا گیا تھا، یہ علاج تجویز کیا گیا، اُس کو میں نے اتنے دن استعمال کیا اب یہ حال ہے، اب ہم آگے کونسا نسخہ استعمال کریں؟ اب آپ ایمان سے بتلا دیجئے

فی صدی کتنے روحانی مریض ہیں جو ایسا معاملہ پیروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ پھر الٹی پیروں کی شکایت ہے کہ توجہ نہیں کرتے۔ اب پیر کیا سر دیدیں۔ کبھی تم نے اپنا مرض بیان کر کے، علاج تجویز کرا کے اس پر عمل کر کے حالات کی اطلاع دیکر آئندہ کو ہدایت لی۔ یا بس ہاتھ میں ہاتھ دے کر اور مریدی کا نام کر کے پھر غائب غلّہ؟ سب کام طریقہ سے ہوا کرتے ہیں۔ غرض فَادْخُلِي فِي عِبَادِي میں جو خاص بندوں کے ساتھ شامل ہونے کا ذکر ہے اُس کا طریقہ برتاؤ کرنے کا یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔

طریق اِصلاح کا نچوڑ دو چیزیں خلاصہ کے طور پر یاد رکھئے۔ اطلاع اور اتباع (پیروی کرنا) یہ دونوں لفظ ہم قافیہ بھی ہیں آسانی کے ساتھ یاد بھی رہ جاویں گے۔ امراض اور حالات کی اطلاع کرتا رہے اور جو کچھ شیخ تجویز کر دے اُس کا اتباع کرتا رہے بس انہیں دو چیزوں کو عمر بھر لئے رہے۔ اپنا کچا چٹھا کہہ دے۔ لوگ پیروں سے بھی اپنے مرضوں کو چھپاتے ہیں۔ بھلا بے کہے کسی کا مرض کیسے ذہن میں آجاوے؟ یہاں تک چاہئے کہ اگر کوئی نیا کام دنیا کا بھی کریں تو اتنا ضرور پوچھ لیں کہ باطن میں تو مُضر نہ ہوگا۔ ہم یہ تجارت کرنا چاہتے ہیں ہمارے مناسب ہے یا نہیں؟ اس غرض سے نہ پوچھے کہ یہ معلوم ہو جاوے گا کہ اس تجارت میں نفع ہوگا یا نہیں اور پیر صاحب اللہ میاں سے پوچھ کر کہدیں گے کہ ہاں ہوگا۔ اس غرض سے ہرگز نہ پوچھے، یہ گندی غرض ہے۔ بلکہ یہ پوچھے کہ ہم فلاں تجارت کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے باطن کو تو مُضر نہ ہوگی ہم فلاں عہدہ پر منتقل ہونا چاہتے ہیں، ہم انگریزی پڑھنا چاہتے ہیں یا طب پڑھنا چاہتے ہیں، یہ ہمارے باطن کو تو مضر نہ ہوگا۔ یہ ہیں پوچھنے کی باتیں اب

تو یہ حال ہے کہ جو جی میں آیا کرلیا۔ پیر کو خبر بھی نہیں چاہے باطن کا پٹڑا ہی ہو جاوے، کہتے ہیں کہ یہ ہمارے دنیا کے معاملات ہیں ان کی اطلاع کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ معاملات کا بھی باطن پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے جب کوئی نیا کام دُنیا کا کرے ضرور اُس کی اطلاع کر کے مشورہ لیلے۔ یہ ہے گویا طریقہ اپنی اصلاح کا۔ یاد رکھو اُن سے اپنے امراض کا کہنا ضروری ہے۔

محقق شیخ مرید کے عیوب پر مطلع ہو کر کبھی اسکو حقیر نہیں سمجھتا اور اگر ان سے امراض

اس لیے چھپاتے ہو کہ یہ ہم کو ذلیل سمجھیں گے تو یہ خوب سمجھ لو کہ وُہ کسی کو ذلیل نہیں سمجھتے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم نے اُس کو پیر ہی نہ سمجھا۔ اوّل تو اُس میں تکبّر نہیں ہوتا وُہ خود اپنے آپ کو سب سے زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں پھر ایسا شخص دوسروں کو کیا ذلیل سمجھے گا؟ میں آپکو اطمینان دلاتا ہوں کہ جو اہلِ تحقیق میں سے ہیں وُہ اللہ تعالےٰ جلنے کسی کو حقیر نہیں سمجھتے۔ غصّہ کرنا اور بات ہے، اس کے راز ہیں دو۔ دو چیزیں ان کی نگاہ میں ہر وقت رہتی ہیں۔ ایک تو اپنے عیوب، جس کی دونوں آنکھیں چٹ ہوں وُہ کانے پر کیا ہنسے؟ دوسرے وُہ عالم میں حق تعالےٰ کے تصرفات کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ سب کی ڈوریاں اللہ میاں کے ہاتھ میں ہیں، جن کو اُدھر کھینچا وُہ اُدھر کھنچ گئے جن کو اِدھر کھینچ لیا وہ اِدھر کھنچ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کو حقیر کبھی نہیں سمجھ سکتے، غرض اُن سے بلاخوف اپنے سب امراض ظاہر کر دو اور علاج کرو۔ جو کچھ وُہ بتلادیں۔ یہ ہے طریق خاص بندوں میں داخل ہونے کا جس کا اشارہ "فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ" میں ہے۔

اور یاد رکھو یہ وہ دولت ہے کہ اس کا آخرت میں تو حظ حاصل ہو ہی گا دنیا میں بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا وہ حظ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب سے یہ سُنا ہے کہ جنت میں آپس میں دوستوں میں ملاقاتیں ہوا کریں گی۔ مجھے جنت کی تمنا ہو گئی ہے یعنی ملاقاتیں احباب فی اللہ تعالےٰ کی یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کی اور اللہ تعالےٰ کے بندوں میں شمار ہونا یہ جنت کی بھی اصل ہے۔ جنت اس کی شاخ اور فرع ہے۔ گویا بالقوۃ ——— دنیا ہی میں جنتی ہے وہ شخص جس نے اللہ تعالےٰ والوں کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ سے تعلق پیدا کیا۔

اب تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ یہ ثمرہ ہے اطمینان کا اور یہ طریقہ ہے۔ اطمینان حاصل کرنے کا۔ دیکھا آپ نے اطمینان کیا چیز ہے گویا دُنیا کا بھی نفع اور دین کا بھی نفع۔ اسی کو فرماتے ہیں: اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ہوشیار ہو کر سُن لو قلوب کا اطمینان صرف ذکر اللہ تعالےٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں۔ اس کے بعد اب ضرورت نہ ہو گی کسی کو پریشان ہونے کی۔ اگر پریشانیوں سے بچنا چاہتے ہو مثلاً بے اولاد ہو، یا کوئی بیماری ہے جس سے تنگ آ گئے ہو تو اصلی علاج یہ ہے کہ خدا سے تعلق پیدا کرو پھر دیکھنا کہاں ہے پریشانی؟ امراء کو ناز ہے اپنے پلاؤ قورموں پر۔ اہل اللہ کو اپنے روکھے سوکھے ٹکڑوں میں وہ مزہ ہے جو ان کو پلاؤ قورموں میں بھی نہیں۔ میں ان چیزوں کے کھانے کو منع نہیں کرتا۔ مطلب میرا اس کہنے سے یہ ہے کہ آپ کو ایک مزہ گھی کا ہے، اور ایک مزہ گوشت کا۔ اُن کو تیسرا مزہ اس تصور کا ہے۔ کہ

یہ خدا کی دی ہوئی چیز ہے، محبوب کے ہاتھ کی ملی ہوئی مٹھائی ہے۔ جب یہ تصور جم گیا پھر واللہ ان کو اس تصور میں وہ مزہ آتا ہے جو امراء کو پلاؤ قورمہ میں بھی میسر نہیں۔ اصل چیز یہ جو لذت کی اُن کے پاس ہے وُہ تو یہ ہے۔ چوتھے بھوک کا مزہ ہے۔ ان کا معمول ہے کہ جس روز بھوک نہیں لگتی اُس روز کھانا بالکل ناغہ کر دیتے ہیں۔ پھر اگلے وقت کس مزے سے کھاتے ہیں؟ اُمراء کے یہاں یہ ہے۔ کہ خادم نے اطلاع کی کہ حضور کھانا تیار ہے۔ حضور نے سوچا کہ بھوک ہے یا نہیں۔ بھلا وہ بھوک ہی کیا۔ جس کے معلوم کرنے کے لیے مراقبہ کی حاجت پڑے؟ کہا کچھ بھوک تو ہے نہیں۔ خادم نے عرض کیا کچھ تو حضور کھا لیں ورنہ نہیں تو سوکھ کے کھجور نہ ہو جائیں گے حضور، حضور نے صرف اس ضرورت سے کہ معمول قضا نہ ہو کہا اچھا لے آؤ۔ ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ“ یہ بھی کوئی وظیفہ ہے کہ قضا نہ ہونے پائے پانچویں یہ لذت ہے کہ مثل اُمراء کے اُن کا یہ معمول نہیں کہ متعدد کھانے کھائیں۔ جو ایک کھانے میں مزہ ہوتا ہے۔ وُہ متعدد کھانوں میں کہاں؟ متعدد کھانے کا اصول طب کے بھی تو خلاف ہے۔ (طب کی کتاب) موجز میں ہے: ”وَكَثْرَةُ الْأَلْوَانِ مُحَيِّرَةٌ لِلطَّبِيعَةِ“ کئی چیزیں اگر کھائی جاویں تو معدہ اچھی طرح ہضم نہیں کرتا، کیوں کہ طبیعت متحیر ہو جاتی ہے۔ اور طبیعت بعد کھانے کے تو متحیر ہوتی ہی ہوگی۔ کھانے ... بھی اس طرح متحیر ہوتی ہے کہ اس کو کھاؤں یا اس کو؟ خیر آدھی بھوک ... میں سے کھا لیا، آدھی بھوک اس میں سے، پھر تیسری چیز نے کہا کہ مجھے بھی کھاؤ۔ آدھی ہی بھوک کی قدر اس میں سے بھی کھا لیا۔ غرض ڈیڑھ بھوک کھا گئے۔ پیٹ ہے یا ربڑ کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے آخر میں ربڑ بڑھی کہیں تک

سلیمانی کھا رہے ہیں کہیں چورن پھانک رہے ہیں۔ ارے اتنا کھایا ہی کیوں تھا۔ ایسے بدمذاق لوگ بھی موجود ہیں۔ کانپور میں ایک صاحب نے میری دعوت کی، جس میں انہوں نے بجائے روٹیوں کے پراٹھے پکوانے چاہے۔ میں نے کہا پراٹھا نہیں کھا سکتا، کیوں کہ مجھے ہضم نہیں ہوتا۔ تو ایک اور صاحب کیا فرماتے ہیں کہ کیوں ہضم نہیں ہوتا معدہ کا علاج کرانا چاہیے۔ میں نے کہا سبحان اللہ کوئی میں اپنا علاج کروں گا تمہارے پراٹھے کھانے کے لئے۔ تو وہ حضرات اکثر ایک کھانا کھاتے ہیں۔ اور بڑے لطف سے کھاتے ہیں۔ امراء اس لطف کے لیے ترستے رہ جاتے ہیں۔ ہم نے بھی مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے یہاں ارھر کی دال اور روٹی کھائی تھی جو مزہ انکے اس کھانے میں آیا وہ بڑی بڑی دعوتوں میں بھی نہ آیا۔

ایک لطیفہ: اس دال پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کا لطیفہ یاد آیا۔ اُن کے یہاں کوئی رئیس مہمان آئے۔ گھر والوں نے پوچھا کہ کیا پکانا چاہیے فرمایا بس دال روٹی بھیجدو۔ عرض کیا گیا کہ حضرت یہ لوگ ایسے ایسے لذیذ کھانوں کے کھانے والے بھلا ان کو دال کیا پسند آئے گی؟ فرمایا کہ میاں "کُلٌّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ"۔ ان کے لئے تو نئی چیز یہی ہے۔ انہیں مزیدار ہی کھانا کھلانا چاہیے۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ خوشامد کی کیا ضرورت ہے؟ وہاں کسی کی خوشامد نہ تھی۔ غرض ان کو کھانے میں بڑا لطف آتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سارے چین حالی، قالی، مالی، ظاہری، باطنی، روحانی جسمانی، دنیوی، اُخروی اگر ہیں تو اللہ تعالےٰ سے تعلق رکھنے والوں کو، وہ افلاک

میں بھی راضی، مرض میں بھی راضی، تکلیف میں بھی راضی، مصیبت میں بھی راضی، غرض سب پر راضی، کسی حالت میں ناراض ہی نہیں۔ اب میں ایک حکایت حضرت بہلول کی نقل کر کے پھر ختم کرتا ہوں، حضرت بہلول نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے۔ فرمایا میاں اُس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو کہ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جو اُس کی خواہش کے موافق نہ ہوتا ہو۔ حضرت بہلول نے عرض کیا کہ حضرت ایسا کہاں سے ہو سکتا ہے۔ یہ تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ فرمایا جس نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو۔ اُس کی خواہش کے خلاف کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے خدا کی خواہش کے موافق ہو رہا ہے۔ اور اس شخص کی خواہش خدا کی خواہش میں فنا ہو کر عین خواہشِ حق ہو گئی ہے۔ لہٰذا جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے۔ اُس کی خواہش کے موافق ہو رہا ہے اور جب خواہش کے موافق ہے تو خواہ کسی حالت میں بھی ہو چین ہے۔

خلاصہ بیان: خلاصہ بیان کا یہ ہوا۔ کہ بس ذکر اللہ تعالےٰ ہی ٹھہری ایک چیز جس میں چین اور اطمینان منحصر ہے۔ اور جس کا طریقہ بھی معلوم ہو گیا اُس طریقہ کا معین ہے اللہ تعالےٰ کے عذاب کا اور اُن کی نعمتوں کا مراقبہ۔ اس مجموعی طریق پر عمل کرنے سے انشاءاللہ تعالےٰ وہ حالات پیدا ہوں گے جس کو ذکر حقیقی کہہ سکتے ہیں۔ خلاصہ طریق کا یہ ہے کہ کسی صاحبِ تحقیق کو اپنا رہبر تجویز کر لو اور اُس کی پیروی کرو اور اس کے دامن کے سایہ میں رہ کر زندگی ختم کر دو۔ اس کے سوائے کہیں چین ہے نہ آرام۔ میں پھر وہی شعر پڑھتا ہوں۔

ہیچ کنجے بے دُد و بے دام نیست ؛ جُز بہ خلوت گاہِ حق آرام نیست ؎

؎ مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ وہ میں کہہ چکا۔ اس کے بعد آپکو اختیار ہے۔ اب دُعا کیجئے کہ اللہ تعالےٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ تمت بحمد اللہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔

مجلس صیانۃ المسلمین فیصل آباد کی دینی خدمات سے آپ مندرجہ ذیل طریق سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ **جامعہ اسلامیہ امدادیہ** ستیانہ روڈ فیصل آباد فون: ۴۲۲۴۶ میں نماز جمعہ سے قبل اور بعد اصلاحی بیانات کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس میں احباب سمیت شرکت فرمایا کریں۔

۲۔ اپنی مسجد یا گھر میں مردوں اور عورتوں کے اجتماعات گاہے بگاہے رکھ لیا کریں۔ اس میں بیان کے لئے مجلس کسی صالح عالم کا انتظام بلا معاوضہ کر دیا کریگی۔ صرف لے جانے اور واپس پہنچانے کا انتظام آپ کر دیا کریں۔ اس مقصد کے لئے وقت مجلس کے تقرر سے قبل دفتر صیانۃ المسلمین ۶۱۵/اے پیپلز کالونی فون: ۴۲۶۱۵ سے یا جامعہ اسلامیہ امدادیہ فون: ۴۲۲۴۶ سے رابطہ قائم کریں۔

۳ دینی مشوروں کے لئے مندرجہ ذیل حضرات سے رابطہ فرمائیں۔

حضرت ڈاکٹر محمد اختر صاحب مدظلہ خلیفہ عارف ربانی حضرت مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہٗ
صدر مجلس صیانۃ المسلمین۔ فیصل آباد،

شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب مدظلہ خلیفہ عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی قدس سرہٗ
نائب صدر مجلس صیانۃ المسلمین فیصل آباد،

منجانب: احقر عبد الحمید عفی عنہٗ ناظم اعلیٰ مجلس صیانۃ المسلمین فیصل آباد،

مجلس صیانۃ المسلمین کا مختصر تعارف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین
بزرگان سلف رحمہم اللہ کی تعلیمات و ارشادات کے مطابق اسلام
کے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق و آداب کی طرف
اجتماعی حیثیت میں تحریراً و عملاً دعوت و تبلیغ کی سعی کرنے والی جماعت کا

"صیانۃ المسلمین" ہے

جماعتی انداز سے اس نام سے کارکردگی کے اصول و قوا
کی تشکیل حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف تھانوی قدس اللہ
نے کی تھی۔ اب حضرت موصوف کے خلفاء کرام اور انکے متو
اسکی سرپرستی کر رہے ہیں۔

مرکزی دفتر:۔
مجلس صیانۃ المسلمین، جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور فون: ۴-۱۵
فیصل آباد میں دفتر:
۶۱۵ اے پیپلز کالونی نمبر ۲ فیصل آباد فون: ۴۳۶۱۵

حکیم الامت حضرت مولانا مجدد اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز

مواعظ کے چند فوائد و برکات

مواعظِ اشرفیہ میں قرآنی آیات اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عجیب و غریب نکات و اسرار بیان کیے گئے ہیں

مواعظِ اشرفیہ ـــــ کے مطالعہ سے اتباعِ سنتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا داعیہ قوت پکڑتا ہے

مواعظِ اشرفیہ ـــــ علم و معرفت کا عجیب خزانہ ہیں۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ کے مطالعہ سے دین کا صحیح فہم پیدا ہوتا ہے۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ سے ایمان میں پختگی، اعمال میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ کے مطالعہ سے سکونِ دل حاصل ہوتا ہے۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ حرارتِ عشقِ الٰہی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ الحاد و نیچریت اور دہریت کے لیے سدِ سکندری ہیں۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ بد دینی کے جراثیم سے تحفظ کا بہترین سامان ہیں۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ صحیح زندگی گزارنے کے راہنما اصول بتاتے ہیں۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ سے طبیعت میں سلامتی اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ میں شبہاتِ جدیدہ کے شفا بخش جوابات موجود ہیں۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ بے غبار صحیح اسلامی تصوف پیش کرتے ہیں۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ دلچسپ و پُرعبرت امثال و حکایات کا بے نظیر گنجینہ ہے۔

مواعظِ اشرفیہ ـــــ کا مطالعہ آپ کی تبلیغ و خطابت میں صحیح انداز اور قوت پیدا کرتا ہے۔

مجلس صیانۃ المسلمین فیصل آباد نے مواعظِ اشرفیہ عمدہ و دلکش طباعت کے ساتھ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔
ذیل کے پتہ پر رابطہ فرمائیں

مجلس صیانۃ المسلمین ۶۱۵۔ اے پیپلز کالونی ۲ فیصل آباد فون ۶۱۵